ثمینہ

رضیہ بٹ

رکشے سے اتر کر مینا نے فٹ پاتھ پہ قدم رکھا اور بلند و بالا عمارت کے ماتھے پر سجے بورڈ پر گردن اٹھا کر نگاہ ڈالی۔ وہ ٹھیک جگہ پر اتری تھی۔ پھر بھی تسلی کرنے کے لئے اس نے بیگ سے اخبار کا وہ تراشا نکالا جس میں "ضرورت ہے" کے کالم میں اس دفتر کا پتہ درج تھا تراشے کو دیکھ کر اس نے ایک بار پھر بورڈ کو دیکھا۔ پوری طرح مطمئن ہو کر اس نے قدم اٹھایا اور عمارت کی طرف بڑھی۔

نو بجنے والے تھے۔ بازار میں زندگی بیدار ہو چکی تھی گو شام والی رونق تو نہ تھی۔ پھر بھی موٹریں رکشے اور تانگے آ جا رہے تھے دکانوں کے دروازے کھلے تھے اور خریداری کا عمل شروع ہو چکا تھا فٹ پاتھ پر چلنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ ریڑھیوں اور زمین پر بڑھائی ہوئی دکانوں پر سستی قسم کا سستا مال سجا تھا۔ کہیں پرانے رسالوں والے بیٹھے تھے تو کہیں موچی اپنی بوری بچھائے پرانے جوتوں کا ڈھیر لگائے مرمت میں مصروف تھا۔

عمارت کے دائیں ہاتھ چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا جس کے باہر سموسوں اور پکوڑوں کی دکان تھی۔ بائیں ہاتھ باٹا کی بڑے بڑے دروں اور صاف شفاف شیشوں والی دکان تھی۔ دکان کا دائیں بائیں سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔

یہ پلازہ نما عمارت تھی اور اس کی نچلی منزل ہی میں وہ دفتر تھے جس میں مینا کو جانا تھا۔ اس عمارت میں کئی دکانیں تھیں۔ کئی دفاتر تھے چھوٹے چھوٹے سینک بار تھے۔

ائرکنڈیشنڈ عمارت میں چھوٹی سی دنیا آباد تھی۔

مینا صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ شیشے کے صاف و شفاف دروازے کو آہستگی سے دھکیلا اور پٹ اسی آہستگی سے چھوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئی دروازے سے ذرا ہٹ کر نیلی وردی میں چپڑاسی کرسی پر بیٹھا تھا مینا نے رک کر لمبے کوریڈور پر نگاہ ڈالی۔ جس میں رویل بلو کارپٹ پڑا تھا۔

"آپ نے کہاں جانا ہے صیب۔" چوکیدار نے مینا سے پوچھا

"ندیم اینڈ کو کا صدر دفتر ادھر ہی ہے نا۔" وہ بولی

"جی صیب ...." سیدھا جاؤ پھر دائیں ہاتھ مڑو۔ دفتر کا نیم پلیٹ نظر آئے گا۔" پٹھان چوکیدار نے معزز خاتون کی راہنمائی شائستگی سے کی۔

"شکریہ۔" مینا بولی۔

"آپ انٹرویو کے لئے آیا ہے۔"

"ہاں۔"

"اور بھی لڑکی ادھر بیٹھا ہے۔"

"انٹرویو نو بجے شروع ہو گا؟"

"ہاں"

"مہربانی خاں بابا"

اور

خان بابا نے عزت افزائی پر خوش ہو کر مینا کو دعا دی۔ "خدا کرے تم کو نوکری مل جائے۔"

"شکریہ" مینا آگے بڑھ گئی۔

مینا نیلی ٹیٹنگ پر بے آواز چلتی کوریڈور میں جانے لگی۔ دائیں بائیں دروازوں پر مختلف لوگوں کی نیم پلیٹیں لگی تھیں کوئی دروازہ نیم وا تھا۔ کوئی بند کسی سے کوئی اندر آ رہا تھا۔ کسی سے باہر جا رہا تھا۔

کوریڈور کے آخری سرے پر لفٹ تھی۔ جس سے اوپر کی منزلوں پر جایا جا سکتا

تھا۔ اس کے متوازی زینہ بھی تھا۔ کچھ لوگ زینے سے اتر رہے تھے۔ ان کی باتوں کی بھنبھناہٹ خاموش فضا کو توڑ رہی تھی اس حصے میں بڑی بڑی فرموں اور کمپنیوں کے دفاتر تھے۔

مینا دائیں ہاتھ مڑی اور تیسرے دروازے پر اسے ندیم اینڈ کو کی پلیٹ نظر آئی۔

اس کا دل دھک کرنے لگا۔

کامیابی کی اسے توقع نہ تھی اور نہ ناکامی برداشت کرنے کی ہمت مفقود تھی۔

اسے نوکری ضرور ملنا چاہئے تھی۔ اس کے مالی حالات اب اس کے متقاضی تھے وہ کئی جگہ انٹرویو دے چکی تھی۔ لیکن تاحال کہیں سے امید کی کرن نہ چمکی تھی۔

وہ جہاں بھی انٹرویو دینے جاتی ماڈرن فیشن ایبل چالاک ہوشیار اور بی اے ایم اے لڑکیاں منہ ٹیڑھا کر کے اردو میں انگریزی بولنے والی لڑکیاں موجود ہوتیں۔۔۔۔۔۔ انٹرویو سے پہلے ہی اسے اپنی ناکامی کا یقین ہو جاتا۔

مینا نے دھڑکتے دل سے دروازہ آہستگی سے کھولا۔ یہاں بھی ایک چوکیدار کھڑا تھا۔

"انٹرویو کے لئے آئی ہیں۔" اس نے مینا کے کچھ کہنے سے پہلے پوچھا۔

"ہاں" مینا نے کہا وہ ایک چھوٹے سے کوریڈور میں کھڑی تھی جس میں تین دروازے کھلتے تھے۔

"ادھر بیٹھئے۔" اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا اور پھر اس سے ضروری کوائف معلوم کئے۔۔۔۔۔۔ مینا نے دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔

یہ ڈرائینگ روم نما کمرہ تھا۔۔۔۔۔۔ صوفے اور کرسیاں شائد ترتیب سے پڑے ہوں گے۔ لیکن بیٹھنے والوں نے خاصا بے ترتیب کر رکھا تھا یہ کمرہ بھی خاصا آراستہ تھا۔ دوسری طرف کھلنے والی کھڑکی کے پردے کھنچے تھے اور بند شیشوں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔

کمرے میں پہلے سے کچھ لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں۔ مینا نے اندر داخل ہوتے ہی سلام کیا چند لڑکیوں نے منہ ہی منہ میں جواب دیا دوسری اسے صرف نظریں اٹھا کر دیکھنے کے بعد باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ وہ ایک معمر عورت کے قریب بیٹھ گئی۔ غالباً یہ ساتھ بیٹھی نوجوان لڑکی کی ماں تھی۔ ماں بیٹی کے چہرے پر ایک جامد سا سناٹا تھا۔ سفید پوشی کا بھرم ان کے دھلے ہوئے سادہ سے کپڑوں سے کھل رہا تھا۔ یقیناً وہ مینا سے زیادہ ہی ضرورت مند تھیں۔

درمیانی میز پر ایک الٹرا ماڈرن لڑکی صوفے پر بیٹھی دوسری لڑکی سے ملی جلی انگریزی اردو میں باتیں کر رہی تھی اس نے سلیولیس بلاوز کے ساتھ نیلی ٹراؤزر پہن رکھی تھی۔ بالوں کو جدید ترین انداز میں سنوارا ہوا تھا۔ کندھے پر بڑا سا چرمی تھیلا جھول رہا تھا جس کے ادھ کھلے زپ سے کاغذات کے سرے نکلے ہوئے تھے۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی جسم خاصا سڈول تھا اور چست بلاؤز کی پٹی کا منہ قدرے کھلا ہوا تھا جس میں سے اس کے سینے کا کچھ حصہ جب وہ سانس لیتی تو نظر آنے لگتا۔

دوسری لڑکی بھی فیشن ایبل ہی تھی۔ اس نے لباس تو سادہ سا پہنا ہوا تھا لیکن میک اپ خوب کیا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ پرکشش تھا اور مسکرانے کا بے ساختہ انداز بھی خوب تھا۔

دو لڑکیاں کھڑکی کے قریب بیٹھی تھیں۔ تیسری کرسی کے ہتھے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ تینوں شاید پہلی بار انٹرویو کے لئے آئی تھیں۔ نچلے متوسط طبقے کی بی اے کر لینے والی لڑکیاں تھیں۔ ان کی نظریں ان ماڈرن قسم کی لڑکیوں پر تھیں۔ چہروں سے احساس کمتری نمایاں طور پر ظاہر تھا۔ اپنے سستے قسم کے لباسوں کا کمپلکس بھی ہو رہا تھا۔

ایک اور خاتون بھی صوفے کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ چالیس بیالیس سالہ عورت سنجیدہ تھی وہ پاکستان ٹائمز دیکھ رہی تھی اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ نوکری کا تجربہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

" آپ بھی انٹرویو کے لئے آئی ہیں........" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد

ساتھ بیٹھی عورت نے مینا سے پوچھا۔

" جی......... ظاہر ہے وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولی

" آپ نے کہیں پہلے بھی نوکری کی ہے۔"

"جی نہیں........"

" میری راشو کی طرح آپ بھی پہلی بار آئی ہیں۔"

"جی۔"

"ہائے ہائے۔" اس عورت نے اک گہری سانس لی۔ پھر بڑے کرب سے بولی

" مجبوری کیا کچھ نہیں کرواتی۔ شکر ہے راشو نے بی اے فرسٹ ڈویژن میں کر لیا اور ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی تربیت لے لی........ عزت و آبرو سے نوکری کر لے گی........"

مینا نے تجسس سے راشو کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔

" اپنے گھر میں راضی خوشی رہ رہی تھی........" ماں نے کہا

"کیا ہوا؟" مینا نے پوچھا

" پچھلے سال اس کے میاں ایکسیڈنٹ میں چل بسے" ماں کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے کو تھے۔ "چھوٹا سا بچہ ہے........"

" اوہو........" مینا کے منہ سے نکلا........

عورت اپنی پر درد کہانی مینا کو سنانے لگی۔ مینا کو اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اسکے دل سے دعا نکلی۔ کہ وہ لڑکی ملازمت کے لئے منتخب ہو جائے۔ لیکن

اس دعا کے ساتھ ہی اس کے دل میں اپنے لئے بھی دعا مچل رہی تھی۔

" راشو کو روپے پیسے کی تو کمی نہیں........ کچھ جائیداد ہے کہ گزر بسر ہو جائے........" عورت نے کہا۔" لیکن پہاڑ سی زندگی گزارنے کے لئے کچھ شغل بھی

تو ہونا چاہئے......"

" پہاڑ سی زندگی۔" مینا کے لبوں سے نکلا اس کے چہرے پر بے رنگ سے سائے لہرائے اور سر جھکا کر وہ اپنی انگلیوں کو مسلنے لگی۔

" نوکری کی تو اسے بھی ضرورت تھی یہاں ہر کوئی ضرورت کا ہی مارا تھا۔" مینا نے سوچتے ہوئے سر اٹھا کر ماڈرن قسم کی لڑکیوں کو دیکھا۔

" یہ بھی تو کسی نہ کسی ضرورت کے تحت ہی نوکری کرنے آئی ہوں گی۔" اس نے سوچا وہ لڑکیاں بڑے اعتماد سے مصروف گفتگو تھیں۔ جیسے یقین ہو کہ نوکری ضرور مل جائے گی ان کے طور طریق سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

مینا راشو کو بھول کر ان لڑکیوں کا جائزہ لینے لگی اسے قوی امید ہو گئی کہ دونوں میں سے ایک کو ضرور جوب مل جائے گی۔

پہلے بھی ایسے ہو چکا تھا۔ جہاں بھی اس نے اس قسم کی لڑکیاں انٹرویو کے لئے آئی دیکھی تھیں انہیں جوب مل گئی تھی۔

سادگی کو تو شاید اس دور میں کوئی اہمیت ہی نہ دیتا تھا۔ تیزی طراری فیشن بے باکی اور تڑ تڑ بولنے والی لڑکیوں کو ہی درخور اعتنا سمجھا جاتا تھا۔

اس دفتر میں لیڈی سٹینو گرافر کی ضرورت تھی۔ تنخواہ انتہائی معقول ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی اور سہولتیں بھی تھیں...... اوقات کار بھی اچھے تھے۔ اور دفتر بھی شاہراہ عام پر واقع تھا۔ آنے جانے کی بھی سہولت ہو سکتی تھی۔ یہ ملازمت جس لڑکی کو بھی ملے گی...... وہ یقیناً خوش قسمت ہو گی۔

دھکے سے دروازہ کھلا اور آگے پیچھے تین لڑکیاں آپس میں اونچی آوازوں میں باتیں کرتی اندر آئیں۔ کمرے کے وسط میں بیٹھی ماڈرن قسم کی لڑکیوں کی طرح ان لڑکیوں نے بھی جدید ترین قسم کے لباس پہن رکھے تھے بڑے بڑے بیگ کندھوں پر ڈال رکھے تھے۔ دوپٹوں سے بے نیاز تھیں دو کے بال تراشیدہ تھے۔ تیسری نے سر کے عین اوپر ننھا سا گول جوڑا بنایا ہوا تھا......

مینا کا دل دھک دھک کرنے لگا کامیابی کے مواقع پہلے ہی کم نظر آ رہے تھے۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر تو خاصی ڈپریشن ہوئی۔ اپنی کامیابی کا یقین تو کیا ناکامی کا سو فیصد یقین ہو گیا۔ اس نے پچھلے ہی دنوں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی تربیت مکمل کی تھی۔ سپیڈ ابھی صحیح نہ تھی۔ تجربہ بھی کوئی نہیں تھا۔ اور تعلیم ایف اے تک تھی۔ ایف اے بھی اس نے چار سال پہلے کیا تھا...... انگریزی کے تو چند جملے بھی ٹھیک لکھنے نہ آتے تھے گھریلو کاموں میں الجھ کر لکھائی پڑھائی بھول چکی تھی۔

لیکن

مالی حالات نے مجبور کر دیا تھا۔ اب تک تو گزارہ چل رہا تھا۔ نانا کی طرف سے ملی ہوئی تھوڑی سی جائیداد جو ادھر تھی بک کر چھ سالوں کا طویل سفر طے کرنے میں مددگار ثابت ہو چکی تھی۔ اب تو دو دکانیں ہی رہ گئی تھیں۔ جن کا کرایہ اتنا ملتا تھا۔ کہ بڑی سی کوٹھی کا ایک الگ تھلگ دو کمروں پر مشتمل حصہ لیا ہوا تھا اور اس کا کرایہ دیا جا سکتا تھا۔ اب وقت گزارنے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی۔ امی کے پاس کچھ زیور تھا۔ جو انہوں نے سیل حوادث سے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ لیکن مینا نہیں چاہتی تھی کہ یہ زیور بھی مجبوریوں کا کھلا منہ نگل جائے۔

یہ زیورات صرف سونے کی نمائشی چیزیں ہی نہ تھیں۔ ان کے ساتھ تو زندگی کی ایسی یادیں وابستہ تھیں۔ کہ وہ انہیں اپنے سے جدا کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی امی اور اس کے ایک ایک زیور پر ابو کے ہونٹوں کی مہر لگی تھی۔ اچھے وقت کی چھاپ تھی۔ ہری بھری زندگی کا خوشگوار تصور ان سے وابستہ تھا۔

ابو جب بھی کوئی نیا زیور بنوا کر دیتے...... اسی وقت امی یا اسے کہتے۔" بھئی پہن کر دکھاؤ۔" وہ جب زیور پہن کر ابو کے سامنے آتی تو ابو کتنی محبت سے کہتے " ادھر آؤ بھئی ہم مبارک باد دیں تمہیں......"

اور جب وہ ابو کے قریب جاتی ابو زیور کو چوم کر اسے اتنا پیار کرتے کہ حیرت زدہ سی انہیں تکتی رہتی۔

"میں اپنی مینا کے لئے اتنے زیور بنواؤں گا کہ لوگ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔"

امی مسکرا کر انہیں دیکھتی "کون سی بڑی بات ہو گی۔ ایک ہی تو ہے جتنا بھی دیں کم ہے۔"

میرا تو سب کچھ مینا ہی کا ہے...... اتنی بڑی جائیداد ہے اسی کی ہے۔ لیکن مجھے زیور کا شوق بہت ہے۔ عورت کا سنگھار ہی اسی سے ہے۔ میں اس کے لئے نایاب سے نایاب چیزیں بنواؤں گا......"

لیکن

وہ چند چیزیں ہی بنوا پائے تھے۔ جائیداد بھی مینا کے نام ٹرانسفر کرنے کی مہلت نہ ملی اور وہ چپ چاپ آنکھیں موند گئے۔

تقدیر کے اس بے رحم وار سے ماں بیٹی بوکھلا گئیں۔ لیکن تقدیر نے تو اس سے کہیں زیادہ مہلک وار اور کرنے تھے...... مینا نے گھبرا کر اپنی سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی اور نئی آنے والی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔

وہ تیز تیز باتیں کئے جا رہی تھیں۔ ہنس رہی تھی اور کسی کسی بات پر قہقہے بھی لگا رہی تھیں۔ کتنی بے غم تھیں وہ...... نوکری حاصل کرنے کے لئے جیسے آئی نہ تھیں۔ یا آئی بھی تھیں تو پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہ نوکری حاصل کر کے ہی لوٹیں گی۔

مینا ان کے رنگ برنگے ڈریس دیکھنے لگی

اور

پھر

اس کی نظریں اپنے آپ پر پڑیں۔ ایک لمحہ کو اسے ملال سا ہوا۔ آخر اس کے پاس بھی تو چند ایک اچھے ڈریس تھے۔ وہی پہن کر آ جاتی۔ ہلکا سا میک اپ کرنے میں بھی ہرج نہ تھا۔ ایک تو تعلیم کم تھی۔ اس پر تجربہ بھی کوئی نہ تھا۔ کیا تھا جو اپنے کو

ذرا سا بنا سنوار لیتی۔ آخر یہ بھی تو لڑکیاں ہی تھیں۔

لیکن

اسے ان لڑکیوں کی طرح ناز و ادا دکھانے کہاں آتے تھے۔ شکل و صورت بھی لوگ ہی کہتے تھے اچھی تھی۔ اسے تو کچھ احساس نہیں تھا۔ اپنی ناک پر تو اسے ہمیشہ ہی غصہ آتا تھا۔ کیا تھا جو ذرا سی تیکھی اور پتلی ہوتی صرف آنکھیں ہی تھیں۔ جو اسے بھی ہمیشہ خوبصورت لگتی تھیں۔ شائد ان آنکھوں سے ہی ناک کا نقص دبا رہتا تھا...... واجبی سی شکل و صورت اور اس پر اتنی سادگی......؟

امکان ہی کہاں تھا نوکری ملنے کا۔

لیکن

جلد ہی اپنی بے تکی سوچوں پر اس نے اپنے کو سرزنش کی اس میں کوئی شک نہیں کہ نوکری کی اسے بہت سخت ضرورت تھی لیکن وہ ایسے سستے ذریعے سے نوکری حاصل کرنے پر لعنت بھیجتی تھی۔ آخر انا بھی کوئی چیز ہے اور انا کے معاملے میں تو وہ بہت حساس تھی۔

اس کے حالات نے بھی تو اسے اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس بنا دیا تھا۔

محتاط رہنے کی عادت تھی۔

اور

اب تو اس نے یہ عادت اس طرح اپنا لی تھی کہ اس کی فطرت کا جزو ثانی بن چکی تھی۔ وہ اب تیئس سالہ پروقار اور سنجیدہ سی لڑکی تھی۔

اس نے پھر اپنے آپ پر نگاہ ڈالی۔ آف وہائٹ شلوار پرنٹڈ قمیض اور اس کے پھولوں کے ہمرنگ دوپٹہ اوڑھے تھی۔ انگلیاں خالی تھیں کان خالی تھے۔ گلا خالی تھا۔ میک اپ نام کی کوئی چیز اس نے استعمال نہ کی تھی سیاہ سیدھے بال چوٹی کی صورت میں گوندھ کر کمر پر چھوڑ دیئے تھے۔ پاؤں میں باریک ڈوریوں والی چپل تھی اور

خوبصورت پاؤں ان میں جکڑے ہوئے تھے۔ بڑا سا بیگ دائیں ہاتھ صوفے پر رکھا تھا۔ جس میں ضروری کاغذ اور کچھ نقدی کے علاوہ چند ٹشو پیپر تھے۔

وہ مایوسی کے عالم میں بڑے بے تکے انداز میں سوچے جا رہی تھی ملازمت کی اسے ضرورت تھی اور یہ ضرورت روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

کرنے کو تو اور بھی کام بہت تھے۔ لیکن ان میں سرمایہ لگانا پڑتا تھا اس کی ایک دوست نے بوتیک کھولنے کی سکیم بنائی تھی۔ اس کی امی تو دونوں دکانیں بیچنے پر رضا مند بھی ہو گئی تھیں۔ لیکن مینا نے اب کوئی بھی چیز نہ بیچنے کی جیسے قسم کھا لی تھی۔ وقت جانے کیسے کیسے رنگ اختیار کرے کون کون سی کروٹیں بدلے اس لئے کچھ نہ کچھ جائیداد یا زیور کی صورت میں ہاتھ میں رہنا ہی چاہئے تھا۔

اور پھر دکانوں کے کرائے سے تو گھر کا کرایہ دیا جاتا تھا دو کمروں ایک برآمدے اور چھوٹے سے لان پر مشتمل یہ گھر ماں بیٹی نے چھ سال پہلے کرائے پر لیا تھا۔ مالک مکان کی شرافت کا عملی مظاہرہ دیکھ چکی تھیں۔ یوں بھی اس گھر میں اب ایک معمر بزرگ کے سوا کوئی مرد نہ تھا اس لئے مینا اور امی کو یہاں سکون و آرام مل رہا تھا۔ مالک مکان کے دونوں بڑے بیٹے باہر تھے ایک بیوی سمیت جرمنی میں تھا۔ دوسرا بال بچوں سمیت قطر میں رہتا تھا۔ گھر میں تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی بیوہ تھی۔ دو بچوں کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ دوسری کی پچھلے دنوں شادی ہوئی تھی اور تیسری ابھی سیکنڈ ائیر میں تھی لوگ اچھے اور دردمند تھے۔ مینا اور امی کے دکھ سکھ میں سگے رشتہ داروں سے بڑھ کر شریک ہوتے تھے۔

سگے رشتہ دار بھی تو تھے......

لیکن

کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا تھا۔ جھوٹے منہ نہ پوچھا تھا کہ گزر بسر کیسے ہوتی ہے۔ ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ ماں بیٹی ایسٹ پاکستان سے اتنا کچھ لے کر آئی ہیں کہ ساری عمر بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔ دینے کے بجائے لینے کے درپے ہی تھے۔ کچھ بھرم ہی

تھا۔ جسے توڑنا ماں بیٹی کو بھی منظور نہ تھا۔ جب ان لوگوں سے سوکھی ہمدردی کی توقع نہ تھی تو پھر انہی حال دل سنانے سے کیا فائدہ؟ اپنے دکھوں کی صلیب جب اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے پھرنا تھی تو پھر ان کی طرف مدد کے لئے دیکھنے کی کیا ضرورت تھی......

رشتہ دار زیادہ تر دوسرے شہروں میں ہی تھے۔ کبھی کبھار کسی خوشی غمی میں ملنا ہوتا تھا۔ ماں بیٹی رکھ رکھاؤ کے معاملے میں محتاط بھی تھیں۔ اس لئے کوئی جان بھی تو نہ پاتا تھا کہ انکے مالی حالات کیا ہیں......

اپنی اوٹ پٹانگ سوچوں سے مینا اس وقت سنبھلی جب پہلی لڑکی کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔

"مس شہلا آصف۔" کلرک نے کمرے میں آتے ہوئے نام پڑھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سفید کاغذ تھا۔ غالباً امیدواروں کی فہرست تھی۔

کھڑکی کے قریب بیٹھی نیلے دوپٹے اور پرنٹنڈ سوٹ والی لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی ــــ بے چاری بے طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے کاغذات اٹھائے اور دوپٹہ ٹھیک طرح سے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے باہر چلی گئی۔

کوئی پانچ سات منٹ بعد دوسری لڑکی کو بلاوہ آیا۔

اور

پھر

تیسری اندر گئی

چوتھی الٹرا ماڈرن قسم کی لڑکی بھی بلائی گئی۔

راشو کا نمبر بھی آیا

اور

اس چالیس بیالیس سالہ تجربہ کار خاتون کا بھی

انٹرویو کے بعد کوئی بھی کمرے میں واپس نہ آ رہا تھا۔ شائد باہر ہی سے وہ واپس جا رہی تھیں۔

راشو کی امی وہیں بیٹھی تھیں۔ وہ انٹرویو دینے کے بعد امی کو بلانے آ گئی۔

"کیا بنا؟" مینا نے بے تابی سے پوچھا۔ باقی چند لڑکیاں بھی جو کمرے میں تھیں۔ اس کے پاس آ گئیں۔

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔" وہ بولی

"کیا پوچھا تھا انہوں نے۔" مینا نے پوچھا

"بس دو چار سوال کئے......... شارٹ ہینڈ اور ٹائپ وغیرہ کا پوچھا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"جاب مل جائے گی آپ کو۔" ایک لڑکی نے بے تابی سے پوچھا۔

کیا خبر........" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی " جاب تو اسے ملے گی جسے اپائنٹمنٹ لیٹر ملے گا ماں بیٹی کمرے سے نکل گئیں۔

پھر کھڑکی کے قریب کرسی کے ہتھے پر بیٹھی لڑکی کو اندر بلایا گیا۔

چند منٹ بعد اسکی ساتھی لڑکی اندر چلی گئی۔

اور

پھر

کلرک نے آ کر تین چار لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے فہرست سے نام پڑھا۔ "مس ثمینہ ملک۔"

مینا اٹھ کھڑی ہوئی......... بیگ میں کاغذوں کو ایک بار ٹٹولا......... ہاتھ سے بالوں کو پیچھے کیا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

ناکامی کا سو فیصد یقین ذہن میں لئے وہ چھوٹے سے کاریڈور سے آفس کی طرف جا رہی تھی......... اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ انٹرویوز برائے نام ہی لئے جا رہے ہیں اصلی لڑکی پہلے سے منتخب ہو چکی ہے کاغذی کارروائی اور خانہ پری کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔

اس کا جی چاہا آفس کے اندر جانے کی بجائے وہیں سے واپس پلٹ جائے۔ اس

کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ایک اور ناکامی کا ٹھپہ اپنے پر لگوائے اور اپنے ساتھ اپنی پرامید ماں کو بھی مایوس کرے۔

" آئیے بی بی۔" کلرک نے اسے کھڑے دیکھ کر ملائمت سے کہا اور آفس کا دروازہ کھول کر اس کے اندر جانے کے لئے راستہ بنا دیا۔

وہ اپنے دھک دھک کرتے دل سے خدا کو یاد کرتی مایوسی میں بھی آس کی لو لگائے اندر داخل ہوئی۔

بے حد شاندار قسم کا دفتر تھا۔ جس کے فرش پر اورنج پھول بوٹوں والا خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا۔ براؤن فرنیچر پڑا تھا۔ آفس ٹیبل چمک رہی تھی۔ پچھلی کھڑکی پر پلین پردہ تھا۔ چھت کے ایک کونے سے سیرامک کا خوبصورت فلاور ہولڈر لٹک رہا تھا۔ دیواریں ٹیک کی تھیں اور دائیں ہاتھ کی دیوار پر شاندار کلاک تھا۔ ایک طرف قائداعظم کی بڑی سی تصویر تھی ایک کیلنڈر تھا۔ دوسری طرف انتہائی شاندار پینٹنگ تھی ایک دروازہ پچھلی طرف شائد کسی دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ دوسرا چھوٹا دروازہ شائد ملحقہ باتھ روم کا تھا۔

آفس ٹیبل پر دو تین فون رکھے تھے۔ ایک طرف پیپر ریک تھا۔ دوسری طرف فائیلیں پڑی تھیں۔ پیپر ویٹ اور پن ہولڈر بھی رکھے تھے مغربی دیوار کے ساتھ فائیلیں رکھنے کی الماری اور ایک شیلف تھا۔

میز کے ادھر دو کرسیاں رکھی تھیں۔ دائیں طرف بھی ایک کرسی تھی۔ جس پر لڑکیوں کو بلانے والا کلرک بیٹھ گیا۔

میز کے دوسری طرف ریوالونگ آفس چیئر پر فرم کا مالک بیٹھا تھا۔ مینا کی نگاہ سب سے پہلے اس کی طرف اٹھی۔ شاندار سا آدمی بڑی تمکنت اور وقار سے کرسی پر بیٹھا ہولے ہولے دائیں بائیں کرسی کو گھما رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پن تھا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے جیسے پن سے کھیل رہا تھا۔

مینا ایک دم جھک گئی۔

اور

اس نے مینا کے سراپا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے وہ آگے کو جھک آیا۔

مینا میز کے دوسری طرف کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

" تشریف رکھئے۔" اس نے پن سے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

" شکریہ۔" مینا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

ایک نظر اس نے بھی ڈرتے ڈرتے اس پر ڈالی۔ وہ بے حد وجیہہ آدمی تھا۔ بھاری بھاری مونچھوں نے اس کے خوبصورت چہرے کو جذباتی حد تک خوبصورت بنا رکھا تھا۔ وہ چوڑا چکلا اور یقیناً اونچا لمبا آدمی تھا...... سکی کلر شرٹ اور براؤن پینٹ پہنے ہوئے تھا...... اس کے بالوں اور مونچھوں کا رنگ بھی براؤنش ہی لگ رہا تھا...... جو اس کے سرخ و سپید چہرے پر بے طرح بھلے لگ رہے تھے۔

مینا اس کی شخصیت سے بے طرح مرعوب تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی سیال سی شے ہے اور آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے۔

اس کا جی ایک بار پھر چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جائے۔

وہ یہاں نوکری نہیں کرے گی۔

دل کی اس آواز پر اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سرزنش کیا" تجھے کیا یقین کہ نوکری مل ہی جائے گی۔ برائے نام ہی تو انٹرویو ہے۔"

اس نے اپنے آپ کو سنبھالا...... اور کرسی میں ٹھیک ہو کر بیٹھ گئی وقتی طور پر وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔ اب اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ ایسے موقعے تو پہلے بھی کئی بار اس پر آ چکے تھے۔ ہر دفعہ وہ بچ کر نکل گئی تھی اپنے آپ پر قابو پا لینا اس نے تجربوں کی بھٹی میں جل جل کر سیکھ لیا تھا۔

اس لئے

کہ

اسے بچ کر نکلنا ہی چاہئے تھا

یہ ضروری تھا۔

بہت ضروری

اور

اس کے سوا

اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا

اس نے اپنا جھکا ہوا سر خود اعتمادی سے اوپر اٹھایا......... فرم کا مالک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جانے اس کے ہونٹوں کی ساخت ہی ایسی تھی یا وہ مسکرا رہا تھا......... مینا نے پلکیں جھپکائیں۔

وہ انٹرویو کے سلسلے میں کوئی سوال کرنے سے پہلے بولا " میرا خیال ہے آپ جاب کے لئے پہلی بار کوشش کر رہی ہیں........."

" جی......... جی ہاں۔" اس کی خوبصورت آنکھوں پر سیاہ پلکیں جھک آئیں۔ لمبی لمبی نوکیلی پلکیں جن پر مصنوعی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

اس نے آہستگی سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا" ہماری شرائط آپ نے اشتہار میں پڑھ لی ہوں گی۔"

"جی" وہ نظروں کے بار بار لڑکھڑا جانے سے الجھ گئی۔

آپ کی کوالیفیکشن؟" اس نے پوچھا۔

مینا نے گود میں رکھے بیگ کو کھولا اور کاغذ نکالے۔ چند لمحے ہاتھ سے انہیں سیدھا کیا اور پھر انہیں اس کی طرف بڑھا دیا۔ صاحب نے فائل کلرک کی طرف بڑھا دی۔

کلرک نے اس کی فائل اپنی طرف کرتے ہوئے اس کی درخواست نکال کر اوپر رکھ دی۔

" تعلیم ایف اے......... تک ہے سر۔" کلرک بولا" شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کا کورس کیا ہوا ہے۔"

" ٹائپ سپیڈ؟" اس نے مینا سے پوچھا۔

" ابھی تو کوئی خاص نہیں سر" وہ بولی

" شارٹ ہینڈ۔"

" وہ بھی........."

مینا نے سر جھکا لیا.........اور وہ زیر لب مسکرانے لگا۔

" تجربہ بھی نہیں ہو گا۔" اس نے کہا۔

" تجربہ تو کام کرنے سے ہی ہو گا۔" وہ آہستگی سے بولی

" محنت کر سکتی ہیں؟"

" جی"

" آپ کو یقین ہے کہ آپ اس دفتر میں خوش اسلوبی سے کام کر سکیں گی۔"

اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ اس کی طرف دیکھا وہ اب بھی پن کے سرے سے جیسے کھیل رہا تھا اس کے چہرے پر اب سنجیدگی تھی۔

" سر آپ موقع دیں گے تو کر لوں گی" اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

وہ کرسی میں پیچھے کو ہٹ گیا.........اور پھر ہولے ہولے کرسی میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا" مجھے اسے دفتر کے لئے انتہائی متین اور سنجیدہ قسم کی خاتون کی ضرورت ہے۔"

مینا نے پروقار انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

" چونکہ دفتر کا سارا عملہ مردوں پر مشتمل ہے اس لئے ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے میں اس نظریے کے تحت انتخاب کر رہا ہوں کہ عورتیں مردوں کی نسبت کام بھی اچھا کرتی ہیں۔ یہی کہا جاتا ہے۔میں بھی یہ تجربہ کرنا چاہتا ہوں........." وہ بدستور سنجیدہ تھا۔

مینا بغور اس کی باتیں سن رہی تھی۔

وہ پن میز پر چھوڑ کر کرسی میں پیچھے کو ہٹ گیا۔ کرسی کی پشت سے کمر لگاتے ہوئے اس نے چند لمحے مینا کو دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا "کیا آپ مردوں کے ساتھ کام کر سکیں گی؟ آپ بہت شائے لگتی ہیں......"

"کر لوں گی سر۔" مینا کے منہ سے نکل گیا۔ اسے اپنے جواب پر حیرت بھی ہوئی ابھی تو وہ یہاں سے بھاگ جانے کا سوچ رہی تھی۔ اور اب کام کرنے کی حامی بھر رہی تھی۔ پھر اس نے جنرل قسم کے چند سوال مینا سے کئے...... جس کا اس نے تھوڑا بہت جواب دے دیا پھر وہ اس کے کاغذات دیکھنے لگا۔

مینا چپ چاپ بیٹھی اپنی انگلیاں مسلنے لگی۔

حمید صاحب۔" فرم کے مالک نے کلرک سے کہا

"یس سر"

"کاغذات دیکھ لئے۔"

"جی"

"ہوں۔"

"پھر وہ مینا کی طرف متوجہ ہوا"

"مس......"

"ثمینہ......" کلرک نے اس کو نام بتایا

"ثمینہ......" اس شاندار آدمی کے ہونٹوں سے یہ لفظ جیسے خواب کے عالم میں پھسل گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ ہلچل سی ہوئی۔ آنکھوں میں سائے لہرائے۔

وہ کچھ بے چینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کا نام بھی ثمینہ ہے۔"

مینا کچھ بھی تو نہ سمجھ سکی حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی "سر ثمینہ کسی کا نام بھی ہو سکتا ہے......"

اس نے زور زور سے سر اثبات میں ہلایا۔ کچھ بے چینی اور اضطراب اب بھی

اس کی ہاتھوں کی حرکت سے عیاں تھا۔ اس نے کہنی میز پر ٹکاتے ہوئے ماتھے کو انگلیوں سے چھوا چند لمحے آنکھیں بند رکھیں۔

مینا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"اف وہ کس قدر شاندار لگ رہا تھا اس انداز سے بیٹھا ہوا......" مینا کی جمالیاتی حس پکار اٹھی

لیکن

"نہیں۔" اس نے سر کو نفی کے انداز میں جھٹکا دیتے ہوئے سوچا "اسے اس آدمی سے یوں امپریس نہیں ہونا چاہئے تھا۔

نہیں

بالکل نہیں......

"سر" حمید نے جب کئی لمحے صاحب کو یوں بیٹھے دیکھا تو مینا کی پریشانی بھانپ کر آہستگی سے بولا۔

"ہوں" صاحب نے سر اٹھایا...... اور حمید کی طرف دیکھا

"میں جاؤں سر" مینا جلدی سے بولی

"جائیں۔" صاحب نے کہا

مینا کا دل بیٹھ گیا۔ ناکامی کا یقین تو اسے پہلے سے تھا۔ لیکن یوں کورا سا جواب پا کر اسے دلی دکھ ہوا...... کچھ چھپے چھپے جذبے اپنا آپ منوانا چاہتے تھے۔ وہ اپنی پوری ہمت اور طاقت سے ان جذبوں سے منحرف ہونے کے باوجود ان کا اعتراف کرنے پر مجبور تھی......"

وہ بے دلی سے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھی اسے اپنے حلق میں گولا سا پھنستا محسوس ہو رہا تھا...... جی چاہ رہا تھا...... پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"شکریہ سر۔" اس نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا اور بیگ اٹھا کر مڑی

......" صاحب کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا

"باہر ویٹنگ روم میں انتظار کریں" اس نے کہا

"کیوں۔" مینا کے لبوں سے حیرانگی کے عالم میں نکلا

"ابھی آپ کو آخری فیصلے سے مطلع کر دیا جائے گا۔" وہ چہرے پر کسی قسم کے اثرات لائے بغیر بولا

مینا چند لمحے بے تکے پن سے اسے تکے گئی۔

"آپ کچھ دیر ویٹنگ روم میں ٹھہریں محترمہ........" اس نے جیسے بیزاری سے کہا

"بہتر سر۔" مینا نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا........ جلدی سے باہر نکل آئی۔

"حمید صاحب۔" اس کے جانے کے بعد اس نے کلرک کی طرف متوجہ ہو کر کہا

"جی صاحب؟"

"کتنے امیدوار باقی ہیں۔؟"

"تین۔"

"ان کی کوالیفکیشن۔"

"دو بی اے ہیں۔ تیسری ایم اے........" ایک لڑکی کو دو سال کام کرنے کا تجربہ بھی ہے........"

"انٹرویو لینے چاہئیں........"

"ضرور سر........"

"پھر بلاؤ........ جلدی کرو........"

"اچھا........ سر۔"

حمید حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھا........ صاحب کا موڈ کچھ بدل چکا تھا۔ وہ گہری گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ صاحب کے

موڈ میں ناگہانی تبدیلیاں آیا کرتی تھیں........ اسے علم تھا........ اسلئے وہ کچھ پریشان نظر نہیں آیا۔ ایسے وقت میں صاحب کی ہر بات مان لینے ہی میں مصلحت ہوا کرتی تھی۔ وہ لڑکی کو بلانے چلا گیا۔

ساری امیدوار لڑکیاں انٹرویو دینے کے بعد جا چکی تھی۔ حمید سب کے کاغذات اوپر تلے رکھ رہا تھا۔ فرم کا مالک اپنی چیئر پر بیٹھا سگریٹ کے کش لیتے ہوئے خیالوں میں گم تھا...... ماضی کے کچھ دریچے وا ہو گئے تھے اور وہ ان سے جھانکتی یادوں کے ننگے چہرے دیکھ رہا تھا۔

حمید نے فائل اوپر تلے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا

"سر"

"ہوں"

"انٹرویو لئے جا چکے ہیں۔"

"ہاں۔"

"مس ثمینہ کو آپ نے انتظار کرنے کو کہا تھا۔"

"اوہ......ہاں"

"پھر ان سے کیا کہوں سر۔"

"انہیں اپائنٹمنٹ لیٹر دے دو۔"

"جی......"

"مس ثمینہ کو میں نے اس جاب کے لئے منتخب کر لیا ہے۔"

"مس ثمینہ کو...... سر......"

"ہاں تم یقیناً درست سن رہے ہو۔"

"لیکن سر وہ کام کر بھی سکیں گی۔"

"کریں گی......انہوں نے کہا تھا وہ محنت کی عادی ہیں......"

"اس نے کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔"

"ہاں"

"سر اس سے بہتر لڑکیاں آئی تھیں...... اس کی تعلیم بھی ایف اے تک ہے ٹائپ کی سپیڈ بھی بہت کم ہے......"

"میں جانتا ہوں۔ تم پہلے بتا چکے ہو۔"

"پھر بھی آپ اسے جاب دے رہے ہیں۔"

"ہاں۔"

چند لمحے حمید چپ ہو کر ندیم کا منہ تکتا رہا۔

"کوئی اعتراض ہے تمہیں......" ندیم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس سے پوچھا

"آپ مالک ہیں سر۔ مجھے اعتراض کرنے کی جرات نہیں۔ پھر بھی کہوں گا کہ اس سے بہتر لڑکیاں انٹرویو کے لئے آئی تھیں......"

پھر

اس نے جلدی جلدی فائل الٹے

"یہ دیکھئے شہلا یوسف...... ایم اے اکنامکس ہیں......"

اور پھر دوسری فائل اٹھاتے ہوئے بولا "نسیمہ راٹھور بھی ایم اے ہیں دو سال کا تجربہ بھی رکھتی ہیں۔"

اور

اس نے تیسری فائل اٹھاتے ہوئے کہا' "مسز وسیم حسن تو اچھی خاصی صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ انہوں نے دس سال مسلسل کام کیا ہے......"

"کوئی اور......؟" ندیم نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا

"یہ رعنا گل بھی بی اے ہیں۔۔۔۔۔۔ ان کی ٹائپ کی سپیڈ۔۔۔۔۔۔"

"کوئی اور خوبی۔۔۔۔۔۔"

"سر آپ بہتر جانتے ہیں۔۔۔۔۔۔"

"میں نے جس لڑکی کو منتخب کیا ہے۔ وہ ہمارے دفتر کے لئے موزوں ترین ہے۔۔۔۔۔۔"

"لیکن کوالیفکیشن!"

"مجھے بردبار قسم کی متین اور سنجیدہ خاتون کی ضرورت تھی اور میرا خیال ہے ثمینہ یہ کام خوش اسلوبی سے کر لیں گی۔۔۔۔۔۔ وہ کسی اچھے خاندان کی لڑکی ہیں۔۔۔۔۔۔ اچھے خاندان کی لڑکیاں سادگی میں بھی اپنا آپ منوا لیتی ہیں۔۔۔۔۔۔ انکا لباس، انداز گفتگو اور لہجہ یہ بتانے کو شائد کافی تھا کہ وہ جاب کے لئے ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔۔"

حمید نے بے یقینی سے سرہلاتے ہوئے ساری فائلیں اوپر تلے رکھ دیں۔

"آپ کی مرضی سر۔ ویسے میرا خیال ہے ثمینہ کام کا معیار برقرار نہ رکھ سکیں گی۔"

"بہت بہتر سر۔"

"آپ انہیں اپائنٹمنٹ لیٹر دے دیں۔"

"بہت اچھا۔"

حمید اٹھ کر اپنی سیٹ پر جانے لگا۔ لیٹر ٹائپ کیا رکھا تھا۔ صرف نام اور پتہ لکھا جانا تھا۔ آخر میں ندیم کے دستخط ہونا تھے۔

حمید کے کمرے سے جانے کے بعد ندیم سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے سوچنے لگا۔

اس نے ثمینہ کو ملازمت دینے کا جذباتی سا فیصلہ کیا تھا۔ یہ وہ جانتا تھا۔

اس نے ثمینہ کو صرف اس لئے جاب دی تھی کہ اس کا نام ثمینہ تھا۔ اگر

کوالیفکیشن اور صلاحیتوں کو مدنظر رکھتا۔ تو شائد یہ لڑکی انتخاب کی کسوٹی پر پورا نہ اترتی۔

ثمینہ

وہ ثمینہ نہ تھی

لیکن اس کا نام ثمینہ تھا

اس نام کے حوالے سے ہی اس نے اس لڑکی پر اتنی بڑی نوازش کر دی تھی۔

وہ اس لڑکی کی شکل و صورت ذہن میں لانے کی جدوجہد کرنے لگا اتنی بہت سی لڑکیوں کے انٹرویوز لئے تھے کہ کئی چہرے آپس میں گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ ہاں اسے کالی کالی خوبصورت آنکھوں کا احساس تھا۔

لیکن

اس سے کیا فرق پڑتا تھا

حوالہ تو صرف ثمینہ نام کا تھا

حمید لیٹر لیے اندر آگیا۔ ندیم کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے اس کی خواہش تھی کہ ندیم اب بھی اپنا فیصلہ بدل ڈالے

لیکن

اس کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ اور ندیم نے جلدی سے سائن کر دیئے

اور

حمید لیٹر لے کر ویٹنگ روم میں آگیا

جہاں بینا کچھ گھبرائی کچھ ڈری کچھ سہمی سی کھڑی تھی۔

"مس ثمینہ۔" کلرک نے اسے پکارا۔

"جی۔" وہ کھڑکی سے ہٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"مبارک ہو۔ آپ جاب کے لئے منتخب کر لی گئیں۔۔۔۔۔۔"

"جی۔۔۔۔۔۔"

مینا حیرت اور خوشی کے جذبوں سے سرتاپا لرز گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ حمید کے قریب آ کر بولی "کیا واقعی.........؟"

حمید نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا......... پھر سر ہلا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں بی بی۔"

"یا خدا........" دونوں ہاتھوں کو الجھا کر مینا نے ایک لمحہ کو آنکھیں بند کر لیں۔

"تیرا شکر ہے۔"

"یہ لیں اپائنٹمنٹ لیٹر........"

مینا نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ پکڑ لیا

"کب سے آؤں گی۔"

"کل سے۔"

"کتنے بجے دفتر لگتا ہے۔"

"آٹھ بجے دفتر لگتا ہے۔"

"اب میں جاؤں؟"

"ہاں......... کل دفتر آ جائیں۔ باقی تفصیلات آپ کو ندیم صاحب بتا دیں گے۔"

"بہت اچھا۔"

"اب آپ جا سکتی ہیں۔"

"شکریہ۔"

مینا نے لیٹر بیگ میں ڈالا......... حمید کو سلام کیا اور کمرے سے نکل آئی اس کے پاؤں ٹھیک سے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے دل اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔ کام ملنے کی خوشخبری وہ بہت جلد اپنی امی کو سنانے کو بے تاب تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکلی دوسرے کوریڈور میں آئی لفٹ کے اندر لوگ جا

رہے تھے۔ کچھ بل کھاتے چوڑے زینے سے چڑھ اتر رہے تھے۔

وہ لوگوں پر اک سرسری سی نگاہ ڈالتی بیرونی صدر دروازے کی طرف جا رہی تھی کہ دائیں ہاتھ کے کسی دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی ہاتھ میں کچھ فائلیں لئے باہر نکلا۔

"ہلو مس ثمینہ........." باہر آنے والا اسے دیکھتے ہی پکارا

مینا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ عمو تھا

"آپ یہاں کہاں؟" عمو مسکراتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔

"انٹرویو کے لئے آئی تھی۔" مینا نے جواب دیا

"دے دیا؟"

"ہاں۔"

"کوئی امکان ہے ملازمت ملنے کا۔"

"بن ہی گیا کام۔"

"کس جگہ؟"

"ندیم اینڈ کو میں۔ سٹینوگرافر کی پوسٹ تھی۔"

"اچھا ہے۔ یہ فرم کافی اچھی فرم ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے مینا کو دیکھ کر بولا۔

"پے وغیرہ خاصی دیتے ہیں یہ لوگ۔"

"بس ٹھیک ٹھاک ہی ہے........" وہ چلتے چلتے بولی

"اچھا ہوا......... آپ کو کچھ شغل چاہئے تھا نا........." عمو نے سنجیدگی سے کہا

"ہاں......... ظاہر ہے" وہ کچھ مضطرب سی نظر آئی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ عمو کسی کام کے لئے اس دفتر آیا ہوا تھا۔

"آپ گھر جا رہی ہیں۔" اس نے فٹ پاتھ پر آتے ہوئے پوچھا

"ہاں"

"میں سکوٹر پر آیا ہوں۔ گاڑی ہوتی تو آپ کے گھر ڈراپ کر دیتا۔"

"شکریہ بہت بہت۔ میں رکشہ لے لوں گی۔"

مینا آگے بڑھی تو عمو چند قدم بڑھا کر سڑک پر آگیا۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کوئی رکشہ اور تانگہ نظر نہیں آیا۔ مینا پرے ہی رک گئی۔

چند منٹ بعد عمو نے ایک خالی رکشے کو روکا...... مینا کے گھر کا پتہ بتایا اور پھر پانچ روپے کا نوٹ اسے دیتے ہوئے مینا سے بولا' "آ جائیے" مینا نے اسے رکشے والے کو پیسے دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جلدی سے بولی "آپ نے پیسے کیوں دیئے یہ غلط بات ہے آپ پیسے واپس لیں۔"

"دیکھئے" عمو ہنس پڑا...... "شرمندہ نہ کریں۔ کوئی اتنی بڑی بات نہیں چلئے بیٹھ جائیں ٹریفک رک جائے گی......"

بری بات ہے......" مینا نے پانچ روپے کا نوٹ بٹوے سے نکال کر عمو کی طرف بڑھا دیا۔

"اوہو۔ حد کرتی ہیں آپ"

"نہیں...... جو مناسب بات ہو وہی کرنا چاہئے......" مینا نے اتنی سنجیدگی سے کہا۔ کہ عمو کو پیسے واپس لینا پڑے۔

"شکریہ" مینا نے ملائمت سے کہا......" عمو نے ہاتھ ہلایا اور رکشا سٹارٹ ہو گیا۔

راستے میں مینا عمو کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔

پچھلے سال عمو کو ایک اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ تو اس نے مینا کے لئے پروپوزل دیا تھا۔ وہ مینا کو پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ اپنی بہن کی منگنی پر اسے دیکھا تھا۔ وہ اسے بھا گئی تھی لیکن ملازمت کے انتظار میں اس نے ایک سال تک اپنی پسند کو مستور رکھا تھا۔ ملازمت ملتے ہی ماں اور بہن کو اس کے ہاں بھیجا تھا۔

اور

پھر

وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا

انکار۔

لیکن ایسا کہ اصرار کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

مینا نے اذیت کے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ رکشا' دوڑتا' اچھلتا اس کے گھر کی جانب جا رہا تھا۔

عمو کے ساتھ ہی اسے سلیم' عرفان اور فیصل کا بھی خیال آگیا۔ یہ سب وقفے وقفے سے اس کے امیدوار بنے تھے اور اب میجر احسان۔

مینا نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دانستہ لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لینے لگی اس کی آنکھوں میں کرب تھا۔

اس نے ٹائپ شدہ کاغذ سمیٹے۔ اوپر نیچے ٹھیک طرح سے رکھتے ہوئے ہال میں بیٹھے لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کی سیٹ آفس کے عین قریب دروازے کے پاس تھی ہال میں کم از کم بیس آدمی اور تھے اور جو اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے کام کر رہے تھے ان میں کچھ معمر لوگ تھے۔ کچھ ادھیڑ عمر چھ سات نوجوان بھی تھے ان میں سے اکثر اپنے کام سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ کچھ مخلص سے دوستی رکھنے والے انسان بھی تھے۔ لیکن چند ایک ایسے بھی تھے جن کی آنکھوں میں جنسی تشنگی تھی اور جب وہ گرسنہ نظروں سے مینا کو دیکھتے تھے تو اس کے سارے وجود میں سرد سرد سی لہریں اٹھنے لگتی تھیں۔ ایسی نظریں اس پر آج تک پڑی کہاں تھیں اسے کبھی کبھی تو بے حد دکھ ہوتا۔ کبھی بے اختیار غصہ آ جاتا۔ جی چاہتا جوتا اتار کر اتنی بے باکی سے اپنے اوپر مرکوز ہونے والی نظروں کو دکھا دے۔ لیکن وہ ضبط و تحمل سے کام لیتی تھی۔ ملازمت اچھی تھی۔ ایسے سرد گرم تو ساتھ لگے ہی رہتے تھے جہاں بھی جوب کرتی ایسی باتیں وقوع پذیر ہونا ہی تھیں۔ اس نے بہت زیادہ محتاط انداز اپنا لیا تھا۔ کسی سے بلا ضرورت بات ہی نہ کرتی۔ چپ چاپ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہتی۔

حامد نے اس سے باتیں کرنے کی کئی بار کوشش کی تھی۔ دبلا پتلا منحنی سا لڑکا جب سے مینا یہاں آئی تھی کچھ زیادہ ہی بن سنور کر دفتر آنے لگا تھا مینا کو اس پر غصہ بھی آتا لیکن لا ابالی عمر کا چھچھورا پن سمجھ کر درگزر کر دیتی غصہ تو اسے پوری طرح ناصر صاحب پر آتا تھا جن کی عمر کم از کم پینتالیس سال تھی سر کے بال کھچڑی تھے

اور مسلسل محنت نے جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا رکھا تھا وہ اس کے اندازے کے مطابق کم از کم آٹھ بچوں کا باپ تھا۔ لیکن جب وہ بھی اس کی طرف دزدیدہ اور بھوکی نظروں سے تک کر ہونٹوں پر زبان پھیرتا تو اس کا جی چاہتا کہ یا تو اس آدمی کا سر پھوڑ ڈالے یا خود استعفے دے کر چلی جائے۔ یہی حال مسعود کا بھی تھا وہ بھی پینتیس چھتیس سالہ آدمی تھا اچھی خاصی خوبصورت اور پڑھی لکھی بیوی تھی۔ دو بچے بھی تھے۔ لیکن وہ بھی تاک جھانک کا عادی تھا مینا سے تو بات کرنے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتا تھا۔

لیکن

اچھے لوگ بھی تھے۔ نوجوان اصغر اسے ہمیشہ باجی کہہ کر بڑے احترام سے مخاطب کرتا تھا۔ ظہیر انور نے کبھی بیٹی یا بی بی کہے بغیر نہ پکارا تھا۔ جمشید بھی بڑے احترام سے مس ثمینہ صاحبہ کہا کرتا تھا۔ مینا اتنی بچی بھی نہ تھی۔ کہ آنکھوں اور حرکات کی زبان نہ سمجھ سکتی۔ شائد اس کے کام پر دلجمعی سے لگے رہنے کی وجہ یہی مخلص اور شریف لوگ تھے ورنہ دو ہفتے کو کیا دو دن بھی کام نہ کر سکتی۔

ویسے اب وہ چاہتی بھی تو ملازمت نہ چھوڑ سکتی تھی یہاں دلجمعی سے لگے رہنے کی وجہ اور بھی تھی

اور

وہ

تھی

ندیم کی شاندار' پروقار اور مرعوب کن شخصیت.......

جس سے وہ جتنا دور ہونا چاہتی تھی اتنا ہی قریب کھنچی چلی آ رہی تھی۔ اس شخصیت نے اس کے مسائل میں اضافہ کر دیا تھا بے چینی اور اضطراب بخشا تھا۔ راتوں کی نیند اچک لی تھی خوف اور مسلسل خوف حواس پر مسلط کر دیا تھا۔

لیکن.......

وہ بے چارگی اور بے بسی سے جیسے ہتھیار ڈال چکی تھی...... اس کے اختیار میں کچھ بھی نہ رہا تھا۔

ندیم اس کی سوچوں کے سمندر میں تلاطم بپا کرنے والا پہلا آدمی نہیں تھا اس سے پہلے بھی کئی شخصیتیں یہ طلاطم بپا کر چکی تھی' فیصل اور محمد سلیم اور چند دن پہلے میجر احسان بھی کچھ ایسا ہی رول ادا کر چکے تھے۔ اس کے ذہن کے ساکن تالاب میں یہ لوگ کنکریوں کی طرح گرے تھے اور بے چینی کی لہریں پیدا کرتے رہے تھے۔ لیکن اب ندیم!

یہ

تو

کسی وزنی پتھر کی طرح آن گرا تھا۔ کچھ اس طرح کہ پانی کناروں سے باہر اچھل آنے کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہیں یہ اچھل اچھل کر باہر آنے والا پانی اس کی اندرونی کیفیات کو مشتہر نہ کر دے۔

"اگر ایسا ہو گیا...... تو......!

وہ سوچ سوچ کر کانپ جاتی۔

کبھی کبھی اسے یہ سوچیں بہت دور لے جاتیں اسے احساس ہونے لگتا کہ وہ بہت جذباتی اور بری لڑکی ہے۔ کوئی بھی نوجوان اس کے خیالات میں تلاطم برپا کر دیتا ہے۔ یہ چھچھورا اور گھٹیا پن ہے۔ آخر وہ نوجوانوں سے کیوں متاثر ہو جاتی ہے وہ اپنے جذباتی تقاضوں کا گلا کیوں نہیں گھونٹ سکتی...... اسے کسی کے من میں بس جانے کی لگن اتنی شدت سے کیوں ہے...... پیار کرنے اور پیار پانے کے جذبوں کو بے موت کیوں نہیں مار سکتی۔ کیا اس کا کردار اتنا کھوکھلا اور بودا ہے۔ اس میں قوت ارادی کی اتنی کمی ہے۔

اسے تو مونگے کی چٹان ہونا چاہئے۔ جس کے ساتھ شوریدہ سر لہریں اپنا سر پھوڑ پھوڑ کر رہ جائیں...... لیکن اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ وہ قرنوں صدیوں بغیر

کسی تبدیلی کے سینہ تانے کھڑی رہے...... اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگتی

لیکن

کبھی کبھی

اسے اپنے آپ پر رحم بھی آنے لگتا۔ وہ جوان لڑکی تھی۔ جس کی آنکھوں میں ادھورے سپنے تھے۔ اسے ان سپنوں کی تعبیر ڈھونڈنے کا حق تھا۔ یہ حق کوئی قانون' کوئی طاقت اس سے چھین نہ سکتی تھی۔ اسے مضبوط بازوؤں کے سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے خوابناک آنکھوں میں کھونے کی لگن تھی۔ اسے بوجھل جذبات سے بھری آواز سننے کی خواہش تھی۔ اسے تحفظ کے لئے کسی مضبوط جسم کا حصار چاہئے تھا۔ اور ان ساری جیتی جاگتی چیختی چلاتی حقیقتوں کے باوجود وہ کچھ پا نہ سکتی تھی...... حاصل نہ کر سکتی تھی۔

کتنی مظلوم

کتنی بے بس

اور

کتنی قابل رحم تھی وہ

مینا کاغذ سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کاغذات ندیم کو دکھانے تھے۔ دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھتے ہوئے وہ آفس کے دروازے کی طرف گئی اور

اپنی سیٹ پر بیٹھے حامد نے ناصر کو دیکھ کر آنکھوں آنکھوں میں کچھ سستے قسم کے اشارے کئے ناصر حسب عادت زبان سوکھے سڑے ہونٹوں پر پھیرتا ہوا حامد کی نظروں کے اشارے سمجھ کر مسکرا دیا۔

مینا آفس میں آ گئی۔ آفس کے باہر بیٹھے چپراسی نے اس کے لئے دروازہ کھول دیا تھا۔

ندیم میز پر جھکا کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا۔ قدموں کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر

مینا کو دیکھا۔

" سر آپ یہ لیٹر دیکھیں گے۔" مینا نے جلدی سے کاغذ آگے بڑھائے۔

"ہاں۔" وہ پھر کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میز سے دو فٹ کے فاصلے پر مینا کھڑی رہی........ اس کی نظریں بار بار ندیم کی طرف اٹھ رہی تھیں........ آج اس نے سپرنٹنڈنٹ پہنی ہوئی تھی۔ گریبان کھلا تھا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا جو اس نے بے دھیان سے الٹا رکھا ہوا تھا۔ سلگتے سگریٹ سے ہلکی ہلکی راکھ از خود جھڑ رہی تھی اور نہ معلوم سا دھواں نکل رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ جلدی جلدی لکھنے میں مصروف تھا۔ سگریٹ والا ہاتھ ایک دوبار اس نے اٹھا کر اپنے بالوں کو چھوا اور پھر اسی انداز میں رکھ دیا۔

مینا چپ چاپ کھڑی رہی

زیست کے کئی لمحے گزر گئے

مینا کو یوں لگا جیسے یہ لمحے بیکار گزر گئے ہوں ندیم پر اسے افسوس بھی آ رہا تھا۔ ایسی مصروفیات بھی کیا۔ جو اسکی موجودگی کو اس نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

لیکن مینا نے اپنے خیالوں پر خود ہی سرزنش کرتے ہوئے سوچا۔ ندیم نے اس کی طرف کبھی توجہ ہی کب دی تھی۔ اس کے جذبات تو یکطرفہ ہی تھے۔ کوئی ایسی بات کوئی ایسی حرکت اس سے سرزد نہ ہوئی تھی جس سے وہ سمجھ سکتی کہ وہ اس میں کسی قسم کی دلچسپی لے رہا ہے۔ ہاں صرف نام کا رابطہ تھا۔ اور اس نے اکثر محسوس کیا تھا کہ جب بھی وہ اسے ثمینہ کہہ کر پکارتا ہے اس کی آنکھوں میں کچھ ٹوٹے ہوئے خوابوں کے سائے لہرا جاتے ہیں........ بس یہی رابطہ تھا........ یہی تعلق........ اس سے زیادہ اب تک کچھ نہ ہوا تھا۔

ندیم کا ہاتھ رک گیا۔ اس کے خوبصورت ماتھے پر کچھ لکیریں ابھریں بھنویں سکڑیں۔ آنکھیں اک لمحہ کو بند کر کے کچھ سوچا........ پھر لکھنا شروع کرتا تھا کہ اچانک اس کی نظر مینا پر پڑی۔

" اوہ اپ کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھ جائیے نا........" اس نے جلدی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

" چند ضروری کاغذات دیکھ رہا ہوں آپ بیٹھئے۔"

" شکریہ سر۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

اک ہلکی سی رسمی مسکراہٹ ندیم کے لبوں پر آئی۔ سر کو اس نے جنبش دی اور پھر سنجیدگی سے کام میں لگ گیا۔

" منٹ بھی نہ لکھ پایا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس نے الٹے ہاتھ سے ریسیور اٹھایا۔

"ہلو۔"

"ندیم"

" شکریہ۔ بس ٹھیک ہوں۔"

" نہیں آج نہیں۔"

" بہانے کیوں بناؤں گا........ کام کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے آج کل۔ بہت مصروف ہوں........"

"ہاں ہاں۔ بے شک شام کو دفتر میں نہیں ہوتا۔ لیکن اتنا تھک جاتا ہوں ثمینہ کہ جی نہیں چاہتا آؤٹنگ کو........"

"گھر میں پڑے بور نہیں ہوتا........"

"کیا کرتا رہتا ہوں؟........ گانے سنتا رہتا ہوں........"

" اچھا بھئی ناراض تو نہ ہونا........ چلو کل شام سہی........"

" ہاں بھئی........ پروگرام تم بنانا۔ میں آ جاؤں گا........"

" ٹھیک ہے........ ہوں........ یہ بھی ٹھیک ہے........ ہاں .... کہہ دیا نا تمہارے رحم و کرم پر رہوں گا........ جہاں جہاں جی چاہے لیے پھرنا........ کھانا بھی کھائیں گے........ مووی بھی دیکھیں گے........ او چاندنی رات کا نظارہ بھی........"

"ہوں۔"

"ہوں۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"خوش ہو گئیں نا۔"

"ممی ٹھیک ہیں......"

"میرا سلام کہنا...... حاضر نہ ہو سکنے کی معذرت بھی کر دینا......"

"بھئی سر آنکھوں پر......"

"منظور ہے۔"

ندیم کھلکھلا کر ہنس پڑا...... اور پھر شائد اسے ثمینہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جلدی سے بولا...... اچھا بھئی کام کرنے دو اب......"

"ٹھیک ہے...... انتظام کرو شام کا...... ٹھیک...... ہوں...... خدا حافظ......"

اس نے ریسور رکھ کر مینا کی طرف دیکھا۔ "سوری آپ کو انتظار کرنا پڑا......"

یہ کاغذات چیک کر لیں سر......" مینا نے سنجیدگی سے کہا۔ ندیم کے فون سے وہ سمجھ گئی تھی کہ کسی لڑکی سے بات ہو رہی ہے۔ یہ لڑکی ندیم کی دوست بھی ہو سکتی تھی...... منگیتر بھی اور یہی جان کر مینا کو لاشعوری طور پر کچھ ڈپریشن سی ہو رہی تھی۔

"ذرا ٹھہریں پلیز...... فون آ جانے سے کام اپ سیٹ ہو گیا۔ میں یہ مکمل کر لوں......"

"سر میں باہر اپنی سیٹ پر چلی جاؤں۔ آپ کام کر لیں تو بلا لیجئے گا......"

"نہیں بیٹھئے......" ندیم نے سگریٹ کی راکھ کرسٹل کی ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔ "بس دو منٹ اور......"

وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی...... اس کا موڈ بے حد سنجیدہ تھا۔ اپنی انگلیوں کو مسلتے ہوئے وہ باس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے ذہن میں ندیم کی فون پر بات چیت کے اڑتے اڑتے الفاظ گونج رہے تھے اپنی سوچوں سے گھبرا کر اس نے ندیم کی طرف دیکھا جو درمیانی میز کے دوسری طرف بیٹھا کام میں مصروف تھا...... اس کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔

کتنے مضبوط تھے اس کے ہاتھ

کیسا چوڑا چکلا تھا وہ خود

صحت مند...... تازہ دم...... کسی پریشانی...... کسی فکر کا اس کے قریب سے جیسے کبھی گزر ہی نہ ہوا ہو...... سوائے اس کی آنکھوں میں اتر آنے والی بے چینی کے...... جو کبھی کبھی ثمینہ کا نام لیتے وقت جھلک دکھا دیتی تھی۔

وقت گزاری کے لیے وہ دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھنے لگی۔ پھر اس نے قائداعظم کی تصویر دیکھنا شروع کر دی...... کیلنڈر پر بھی نگاہ پڑی

آج اسے کام کرتے ہوئے اٹھارہواں دن تھا...... اٹھارہ دن جیسے اٹھارہ صدیوں پر محیط تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مدتوں سے یہاں ہے اور ندیم کے ساتھ کام کر رہی ہے انسانی ذہن بھی کیا عجیب و غریب شے ہے کیسے کیسے احساسات کو جنم دیتا ہے کیسے کیسے جذبات ابھارتا ہے۔ مینا نے اک گہری سانس لیتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"ہاں تو مس ثمینہ صاحبہ......" ندیم نے پن اور کاغذ ایک طرف کرتے ہوئے کرسی میں پیچھے کو ہوتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

ثمینہ کے جسم میں اس مسکراہٹ سے کپکپی سی ہوئی۔ اس نے جلدی سے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔

ندیم نے زیر لب مسکراتے ہوئے پن اٹھا لیا۔

اور

مینا کا دل کانپ گیا

وہ ٹائپ کی بے شمار غلطیاں کرتی تھی۔ ندیم ہر غلطی تلے پن سے لکیر کھینچ دیتا تھا اور مینا کو وہ کاغذ دوبارہ ٹائپ کرنے پڑتے تھے وہ بہت کوشش کرتی لیکن غلطیاں ہو ہی جاتیں۔ اس کی رفتار بھی ابھی مایوس کن تھی اسے خدشہ تھا کہ کہیں روز روز کی ان غلطیوں سے تنگ آ کر ندیم اسے ملازمت سے جواب ہی نہ دے دے۔

وہ اپنی انگلیوں کو بے تابی سے مسلتے ہوئے گاہے گاہے سر اٹھا کر ندیم کو دیکھ رہی تھی۔

آج نسبتاً غلطیاں کم تھیں۔ پھر بھی اس نے ثمینہ سے کہا "آپ احتیاط سے کام کیا کریں۔"

"کرتی ہوں سر۔"

"پھر بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

اس نے سادگی سے سر ہلا دیا۔

ندیم نے غور سے اسے دیکھا...... اور چند ثانیے کاغذ بھول کر اسے دیکھتا ہی رہا۔

ثمینہ گڑبڑا گئی۔

"یس سر......" اس نے کاغذات لینا چاہے......

"نہیں......" وہ بدستور اسے تکتے ہوئے بولا۔

مینا گھبرا گئی۔ اس کے گال سرخ ہو گئے اور اپنی خوبصورت پلکیں اس نے دو تین بار جھپکا جھپکا کر ندیم کو دیکھا

"ابھی دو لیٹر دیکھنے باقی ہیں مس ثمینہ......" ندیم کو اپنی غیرارادی حرکت کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔ تو جلدی سے بولا...... "یہ خط آج ہی ڈسپیچ کرنے ہیں۔ ضرورت ہو۔ تو دوبارہ ٹائپ کر دیں' ورنہ یہ لفظ پن سے ہی ٹھیک کر کے لے آئیں......"

"بہتر سر......"

وہ پھر کام میں منہمک ہو گیا دونوں دوسرے خط خلاف توقع غلطیوں سے مبرا تھے۔

"شاباش" ندیم مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر بولا۔ "کافی امپرود کیا ہے آپ نے"

"شکریہ سر۔"

"کوشش جاری رکھیں۔"

"اچھا"

"یہ لیجئے۔ پہلے دونوں خطوط کو ٹھیک کر کے لائیے"

اس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ پکڑ لیے۔ اور اٹھتے ہوئے بولی" اب میں جاؤں سر۔"

"ہاں ابھی ٹھیک کر کے لائیے لیٹرز۔"

"بہت اچھا سر...... ابھی لاتی ہوں۔"

"جلدی میں اور یہ بھی غلط نہ کر لائیے گا۔" وہ ہنسا اور یہ ہنسی مینا کو طنز کی چبھن محسوس ہوئی۔ یہ چبھن دل میں اتر گئی۔

وہ بے دلی سے کاغذ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ ندیم نے نیا سگریٹ سلگایا اور کام میں دوبارہ مصروف ہو گیا۔

"احسان"

"جی امی"

"کیا خیال ہے پھر۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو جاؤں ان کے ہاں اب اپنا سوال لے کر"

"ضرور جائیں...... آپ کو پسند ہے تو میں ناپسند کرنے والا کون۔"

"چل چالاک نہ بن اتنا...... باربار یہ چالاکی نہیں چلے گی۔

"سچ کہہ رہا ہوں امی۔ آپ کی خوشی میری خوشی"

"اتنا احسان نہ کر مجھ پر...... پسند نہیں ہے تو اب بھی کہہ دے۔"

"احسان تو ہے ہی آپ پر......" وہ ہنس دیا۔ امی بھی اس کی بات پر مسکرانے لگی۔

دونوں ماں بیٹا لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ٹی وی پر کوئی غیردلچسپ پروگرام ہو رہا تھا وقت گزاری کے لیے دونوں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ احسان پورے اکیس دن سکیم پر گزارنے کے لیے کل جانے والا تھا۔ امی نے یہی موقع مناسب سمجھا...... اور اس کا عندیہ لینے کے لیے بات کی مینا کو اس نے مالک مکان کی بیٹی کی شادی پر دیکھا تھا سادہ سی لڑکی اسے احسان کے لیے پسند آ گئی تھی۔ مالک مکان سے ان کے دوستانہ مراسم تھے کچھ دور پار کی رشتے داری بھی تھی۔ اس لیے جب رخصتی ہو گئی۔ تو اس

نے بڑی رازداری سے مینا کے متعلق ان سے پوچھا۔

"کون لڑکی ہے یہ۔"

"ہماری کوٹھی کے پورشن مین کرایہ پر رہتے ہیں یہ لوگ۔"

"ہیں کون لوگ؟"

"بس ماں بیٹی ہی ہیں۔"

"باپ؟"

"بہت پہلے فوت ہو چکا ہے۔"

"لڑکی کیس ہے؟"

"بہت نیک شریف اور حلیم الطبع...... چھ سال سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہیں......" کبھی اونچی نیچی بات نہیں کی...... بہت پسند ہیں مجھے تو......"

"اس کی ماں کونسی ہے۔"

یوں احسان کی امی اور مینا کی امی متعارف ہوئیں وہ چونکہ خود بھی سیدھی سادی عورت تھی اس لئے دونوں میں اس قدر مشترک کی وجہ سے پہلی ملاقات ہی میں بے تکلفی اور خلوص کا رشتہ استوار ہو گیا۔

ایک ہفتے کا وقفہ دے کر وہ احسان کو ساتھ لے کر مینا کے گھر گئی۔ مینا تو گھر پر نہ تھی ماں بیٹا اس کی امی کے پاس بیٹھ کر چلے آئے۔

مینا کی امی احسان کو بھی اچھی لگی۔ تصنع اور بناوٹ کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لینے والے دور میں اس قسم کے لوگوں کا ملنا خوشی کا باعث تھا۔ امی احسان کو ساتھ تو اس لئے لے گئی تھیں۔ کہ وہ بھی ایک نظر مینا کو دیکھ لے۔ لیکن یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

احسان امی کی اس ناکامی پر خوب ہنسا۔

سمجھ لیں کہ یہاں کامیابی نہ ہو گی۔" اس نے کہا تھا۔

"آخر کیوں میں تیری پسند کے بغیر بھی اسے بہو بنا کر لا سکتی ہوں۔" امی نے بھی چڑ کر کہا۔

"نانا امی پیاری۔ اتنا ظلم نہ کیجئے گا...... کم از کم ایک نظر مجھے اس ذات شریف پر ڈال لینے کی اجازت ضرور دیجئے گا...... معلوم وہ کس صدی کی شے ہے۔"

"فکر نہ کرو اسی صدی کی ہے۔"

"آپ کا پتہ بھی کیا۔ آپ کو ہر وہ چیز پسند ہے جو وقت سے بہت پیچھے ہو۔"

"اوہو...... بڑا آیا میری پسند پر اس طرح کا تبصرہ کرنے والا......" میجر بن گیا ہے تو یہ نہ سمجھ سارے زمانے کی خوبیاں تجھ میں سما گئی ہیں۔"

"توبہ توبہ یہ کب کہا میں نے...... صرف یہی کہا ہے نا رشتہ کرنے سے پہلے صرف ایک نظر......"

امی سوچ میں پڑ گئی تھیں...... لیکن جلدی انہوں نے عقدہ حل کر لیا تھا...... چٹکی بجاتے ہوئے مسکرا کر بولی تھیں "کر لیا حل......"

کیا......؟"

"سارا مسئلہ"

"کیسے؟"

"سائرہ کی شادی کی دعوت تو کرنا ہی ہے۔"

"بالکل کرنا چاہئے۔ ان لوگوں نے بھی تو ہمارے صومی آپا کی شادی کی دعوت بڑی شاندار کی تھی......"

"ہاں، بس دعوت کر ڈالتے ہیں......"

"سائرہ کی دعوت سے مسئلہ حل کیونکر ہوا۔"

"بھئی ساتھ ان ماں بیٹی کو بھی مدعو کر لیتے ہیں۔"

"آ جائیں گے وہ......"

"کیوں نہ آئیں گے وہ......"

"کیوں نہ آئیں گی۔ ہم بھی تو ان کے ہاں ہو آئے ہیں۔"

احسان نے ماں کی سکیم پر سر ہلایا...... داد کے طور پر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر انہیں پیار کر لیا۔

"چاپلوس۔" امی اس کی بانہوں کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

اسی ہفتے دعوت کا اہتمام ہوا۔

سائرہ اس کے میاں اس کے والدین اور بہنوں کے ساتھ مینا اور اس کی امی کو بھی دعوت دی گئی۔

مقررہ وقت پر سب لوگ آ پہنچے۔ مینا نے آنے میں کچھ پس و پیش کی تھی۔ لیکن سائرہ کے اصرار پر امی کے کہنے پر آنا پڑا تھا۔

احسان اپنی امی کے ساتھ مہمانوں کے استقبال کے لئے گیٹ کے قریب ہی لان میں کھڑا تھا...... مینا نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا ہاں اس کی امی اسے جانتی تھی۔

احسان نے بڑے مودبانہ انداز سے امی کو سلام کیا تھا......اور مینا کا بھی ہلکی سی مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا تھا۔

دعوت کے دوران احسان دو تین بار مینا کے قریب آیا تھا اور بڑی شگفتگی بے تکلفی اور احترام سے باتیں کی تھیں۔

"آپ پڑھ رہی ہیں۔" اس نے پوچھا تھا

"جی نہیں۔"

"کیا شغل ہے۔"

"گھر بیٹھی ہوں۔"

"کہاں تک تعلیم پائی۔"

"ایف اے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔"

"پڑھائی مشکل لگتی تھی کیا۔"

"کچھ ایسی ہی بات سمجھ لیں۔"

اور پھر دونوں نے موسم کی باتیں بھی کیں تھیں۔

"گرمی کافی تیزی سے اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔"

"اس کا وقت ہے اپنا حق تو استعمال کرے گی۔"

"مجھے ذرا نہیں اچھی لگتی......"

"سردی واقعی اچھی ہوتی ہے۔ خاص کر سردیوں میں بارشیں تو بہت لطف دیتی ہیں......"

"جی ہاں ضرور دیتی ہیں۔ کسی غریب سے بات کر کے دیکھیں۔"

"وہ بے چارے تو سردی گرمی دونوں سے ہی نالاں ہیں۔"

"نہیں جی...... گرمی انہیں زیادہ تکلیف نہیں دیتی۔"

"ہاں یہ بات سچ ہے۔"

رسمی رسمی باتیں دونوں کے درمیان ہوئیں۔ احسان کی امی احسان کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اس بات سے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ مینا انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ آج بھی اس کی سادگی میں جو وقار تھا اس سے وہ اپنی پسند سا محسوس کر رہی تھیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اس نے احسان سے پوچھا تھا "کیوں بیٹے؟" اور وہ امی کو ستانے کے لئے جان بوجھ کر بولا تھا "کیوں امی؟"

"کیا خیال ہے۔"

احسان نے منہ بنایا تو امی کا دل دھک سے رہ گیا۔ "مینا کے متعلق پوچھ رہی ہوں۔"

"بس واجبی سی ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"حسینہ مہ جبیں نہیں ہے۔"

"تو تجھے کیا کوئی عرش سے اتری ہوئی حور چاہئے۔"

"شادی زندگی میں ایک بار ہی کرنی ہے۔ حور ہو جائے تو کیا حرج۔"

"احسان۔"

"دیکھئے ذرا دھمکا کر بے شک راضی کر لیں مجھے...... ویسے۔"

"ویسے کیا......"

امی حیران سی احسان کو دیکھنے لگیں۔ احسان کو امی کی شکل دیکھ کر ہنسی آگئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولا "بس سب ٹھیک ہے امی۔ مینا بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔"

"تیرا بھلا ہو......" امی نے جلدی سے کہا "کبھی تو سنجیدگی سے بات کیا کر۔"

ماں بیٹے میں معاملہ طے ہو گیا......امی نے کوئی مناسب موقع دیکھ کر مینا کی امی سے اس سلسلہ میں بات کرنے کا سوچ لیا۔

"کل ہی نہ پہنچ جایئے گا وہاں......" احسان نے کہا۔

"نہیں نہیں...... ایک بار ایسے ہی جاؤں گی۔ پھر مطلب کی بات کروں گی......"

ایک بار ماں بیٹا مینا کے ہاں گئے۔

اور مینا کی دنیا میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔ جذبات کے ساکت سمندر میں پھر کنکری گری تھی اور ہلکی ہلکی لہریں دل کی دیواروں کو چھونے لگی تھیں۔

آج

احسان کی امی پیغام لے کر مینا کے ہاں جا رہی تھی۔ جانے سے پہلے ایک بار پھر احتیاطاً اس نے بیٹے کی رضامندی حاصل کی تھی۔

احسان ماں کو چھوڑنے مینا کے ہاں گیا۔ تو وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔

اس کی امی بھی وہیں تھیں۔ علیک سلیک اور احوال پرسی کے بعد وہ دونوں اندر چلی گئیں۔ احسان باہر ہی مینا کے پاس رک گیا۔

آج اس کی نظروں میں بڑا والہانہ پن تھا۔ مسکراہٹ لبوں سے پھسلی جاتی تھی۔ مینا کو وہ نئے انداز سے تک رہا تھا۔

" جاب مل گئی آپ کو۔" اس نے مینا سے پوچھا۔

" ہاں۔"

" کیسے لگتا ہے۔"

" کیا؟"

" روز دفتر جانا۔"

" بہت اچھا۔" مینا کی نگاہوں میں ندیم کا شاندار وجود گھوم گیا۔ اور بے ساختہ یہ لفظ اسکے منہ سے نکل گئے۔

" آپ گھر بیٹھے بیٹھے بور ہو چکی ہوں گی۔ اس لئے یہ تبدیلی خوشگوار لگی۔"

" ہاں یہی بات ہے۔"

" تبدیلی خوشگوار ہی ہوتی ہے۔"

" ضروری تو نہیں........"

مینا چند لمحے کھڑی رہی........ پھر احسان سے اندر چلنے کو کہا۔ وہ اندر چلا گیا۔ مینا چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

احسان اندر گیا تو امی مینا کی امی سے کہہ رہی تھیں۔ "میں آج ایک خاص مقصد سے حاضر ہوئی ہوں۔"

احسان نے کرسی کی پشت پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جانے مینا کی امی کا کیا جواب ہو۔

"فرمایئے۔" مینا کی امی کے چہرے پر سناٹے تھے۔ شائد وہ احسان کی امی کا مقصد سمجھ گئی تھیں۔

"مینا کو میری بیٹی بنا دیجئے۔" امی نے مسکراتے ہوئے مینا کی امی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اور

اس بات سے سناٹے مینا کی امی کے سارے وجود پر چھا گئے۔ وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔ چند لمحے تو ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نہ نکل سکا ہاں چہرے سے کرب و اذیت کے آثار پوری طرح ہویدا تھے۔

احسان کی امی نے بڑے غور سے انہیں دیکھا۔ کچھ سمجھیں نہیں لیکن پھر بھی مسکراتے ہوئے بولیں۔ "احسان آرمی میں میجر ہے اس کے کردار کے متعلق کیا کہوں آپ خود ہی پتہ کروا لیں۔ خود آپ کے سامنے موجود ہے۔ اس سے پوچھ لیں........ اور بھی اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ کوٹھی ہے گاڑی ہے۔ تھوڑا بہت زیور نقدی بھی ہے میرے دو ہی بچے ہیں صوفی کی شادی ہو چکی بس احسان ہی ہے........"

مینا کی امی نے اک ٹھنڈی اور گہری سانس لی۔ پھر کرب کی منزلوں سے گزرتے ہوئے بولیں "کاش میں آپ کی خواہش پوری کر سکتی"

"کیوں........؟" چونک کر امی نے پوچھا اور احسان کے چہرے پر بھی استفسار نظر آیا۔ مایوسی کی لہریں اس کے مسکراتے چہرے کو دھندلا گئیں۔

مینا کی امی نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "کیا بات ہے بہن۔" احسان کی امی نے پوچھا

وہ ضبط نہ کر سکیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے نکلے اور گالوں پر بہنے لگے۔

احسان اپنی کرسی کی پشت چھوڑ کر ان کی کرسی کی پشت پر آ گیا۔ ماں بیٹے نے حیرت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کچھ بتائیں نا؟" احسان کی امی نے اپنے ہاتھ سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا احسان کے صبر و ضبط کی قوت بھی جواب دے رہی تھی........ اس کے چہرے سے اذیت عیاں تھی

"یہ بات نہیں ہو سکتی۔" مینا کی امی نے بڑے سوز سے کہا "ہماری بدقسمتی ہے

بس اس کے سوا اور کیا کہوں۔"

"لیکن......... کیوں نہیں ہو سکتی آنٹی......... یہ بات" امی کی بجائے احسان نے جلدی سے کہا۔

مینا کی امی نے آنکھیں پلو سے صاف کیں۔ آہیں ان کے سینے میں ٹوٹ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے اپنے آپ پہ قابو پایا۔

ا۔

پھر

ہولے ہولے ماں بیٹے کو اپنی بے بسی بتانے لگیں۔

ماں بیٹے کی حیرانگی دید کے قابل تھی۔ مینا کی امی کی باتوں نے انہیں ششدر کر دیا تھا۔ سمجھ نہ پا رہے تھے کہ کیا کہیں

دونوں چپ تھے یوں جیسے سانپ سونگھ گیا ہو

وہ کر بھی کیا سکتے تھے

ان کی مجبوری کو سمجھ کر خاموش ہی ہونا تھا نا

لیکن

احسان کو قلبی دکھ ہوا تھا......... وہ بجھ گیا......... اس کی آنکھوں میں بجھتے چراغوں کا دھواں پھیل گیا......... اس کی امی بھی مایوس ہو گئی تھیں

مینا ندیم کے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔ ندیم نے کچھ خط و کیسٹ کروانے تھے۔ وہ کاغذ قلم سنبھالے بیٹھی تھی۔ کچھ مرعوب مرعوب سی کچھ محجوب محجوب سی۔ سر اٹھا کر ندیم کو دیکھنے کی جرات نہ کر پا رہی تھی یہ شخص اپنی تمام تر مردانہ وجاہتوں سے اس پر تسلط جمانے کو حملہ آور ہو چکا تھا اور وہ بلا کسی مزاحمت کے شکست مان چکی تھی۔ اسے ندیم کے جذبات کا علم نہ تھا۔ کیا وہ بھی اس میں کچھ دلچسپی لیتا تھا۔ یا صرف اس کی اپنی دلچسپیاں تھیں۔ جو کسی دوسری لڑکی کے گرد گھوم رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ دوسری لڑکی جو اتفاق سے ہی ثمینہ نام کی تھی۔ فون پر اکثر ندیم سے باتیں کیا کرتی تھی۔

دونوں کے تعلقات کا اسے پوری طرح علم تو نہ تھا۔ ہاں وہ اتنا ضرور جان گئی تھی کہ ماضی ان دونوں کے لیے خوشگوار دوستی کا ضامن تھا۔ اس خوشگواری میں اب کچھ جھول آ رہے تھے اور ندیم کچھ الجھا الجھا رہنے لگا تھا جھول آنے کی وجہ تو اسے معلوم نہ تھی۔ ہاں کبھی کبھی وہ لحہ بھر کو خوش فہمی میں مبتلا ہونے کو یہ وجہ اپنی ذات بنا لیتی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے تلخ حقیقت کا احساس ہونے لگتا

مینا نے آج بھی سادہ سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہلکے کاسنی رنگ کا پھولدار وائیل کا سوٹ تھا اور کاسنی رنگ کا دوپٹہ اس نے کندھوں پر ڈال کر سینے پر گرا رکھا تھا۔ اس نے بالوں کو کس کر جوڑے کی شکل میں باندھا ہوا تھا چند آوارہ لٹیں سرکشی پر اتر آئی تھیں۔ جنہیں وہ بار بار کانوں کے پیچھے لے جاتی اور وہ موقع پاتے ہی گالوں

کے سروں کو چھو لیتیں

ندیم کرسی پر ہولے ہولے دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ جنہیں وہ پڑھ رہا تھا۔

"ہوں۔" اس نے کاغذ ایک طرف رکھتے ہوئے مینا کی طرف دیکھا گہری گہری نشیلی آنکھیں اپنے اوپر مرکوز پا کر.. سنبھل بیٹھی

"فرمایئے سر۔" اس نے کاغذ میز پر پھیلاتے ہوئے قلم کی نب کو دوسرے ہاتھ پر چلا کر دیکھا۔ اور لکھنے کو تیار ہو بیٹھی۔ "کیا لکھوں سر........"

"آپ کو دفتری زندگی کیسی لگی" ندیم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

"آپ کو دفتری زندگی کیسی لگی۔" مینا جو قلم سنبھالے لکھنے کو تیار بیٹھی تھی۔ کاغذ پر لکھ لیا

وہ آگے لکھنے کو منتظر تھی۔ چند لمحے ندیم کچھ نہیں بولا۔ تو اس نے جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر ندیم کو دیکھا

وہ اس کے لکھنے پر مسکرا رہا تھا

مینا کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا........ ندیم اب بھی مسکرا رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اس کا منہ تکنے لگی۔ کمرے کی خنک فضا میں بھی اسے پسینہ آ گیا۔

وہ ہنس دیا

"میں آپ سے پوچھ رہا تھا مس ثمینہ۔ لکھوا نہیں رہا تھا

"اوہ۔"

"آپ پہلی دفعہ کسی دفتر میں کام کر رہی ہیں۔"

"جی۔"

"کیسا لگتا ہے کام کرنا........؟"

مینا کے چہرے پر کچھ سائے سے لہرا گئے........ اس نے دو ایک بار ندیم کی طرف دیکھا

"کاش وہ بتا سکتی کہ اسے یہاں کام کرنا کیسا لگتا ہے........"

وہ ناخن پر نب رگڑنے لگی

"ہوں۔" وہ اب بھی اسے غور سے تک رہا تھا

"بس........" وہ ہچکچاتے ہوئی بولی "ٹھیک ہے سر۔"

"ہال میں آپ واحد خاتون ہوتی ہیں۔"

"جی۔"

"کوئی پرابلم تو نہیں........"

اس کا سر جھکا ہی رہا۔ اور وہ نب دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن پر ہولے ہولے رگڑتی رہی

"اگر کوئی مسئلہ ہے۔ تو بے دھڑک بتا دیں........ ہال میں آپ کو مردوں کے ساتھ آٹھ گھنٹے بیٹھنا پڑتا ہے۔ شائد آپ سہولت محسوس نہ کرتی ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بڑی بے چینی سے ندیم کو دیکھا وہ میز پر بازو رکھے پیپر ویٹ کو ہاتھوں میں لیے ہوئے تھا........ مینا کی بے چینی سے وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا۔

"کوئی بات ہے ضرور........" اس نے ملائمت سے کہا

"جی۔ جی کچھ نہیں........" مینا نے دو تین بار پلکیں جھپکائیں اور اس کی آنکھوں میں وہ خبیث چہرے لہرا گئے۔ جن کی وجہ سے اسے اذیت ہوتی تھی لیکن مجبوری تھی۔ وہ ان لوگوں کا کیا کر سکتی تھی۔

"کسی نے کچھ کہا........؟" ندیم نے پوچھا........ تو ہمدردی دل کھا گئی مینا کی خوبصورت سیاہ آنکھیں دھندلا گئیں۔ لیکن کمال ہمت سے آنسو آنکھوں میں پیتے ہوئے ٹوٹتی آواز میں بولی "کسی نے کچھ نہیں کہا سر۔ اگر کوئی کچھ کہہ بھی دے........ تو مجبوری ہے........ مجھے تو کام کرنا ہی ہے........"

ندیم اپنے سامنے بیٹھی اس سادہ سی لڑکی کو ایک ٹک تکے جا رہا تھا اس کی

آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نے اسے بے چین کر دیا........ وہ اپنے اندر کی اس تبدیلی پر خود بھی حیران ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

"مس ثمینہ........" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے سنجیدگی سے بولا

"جی"

"آپ ہال میں یقیناً ڈسٹرب ہوتی ہیں........"

مینا گھبرائی۔ کہیں یہ چھوٹی سی بات ہی ملازمت چھن جانے کا باعث نہ بن جائے اس کے دل کو دھچکا لگا۔ وہ کسی قیمت پر بھی یہ ملازمت چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔

جلدی سے سر نفی میں ہلاتے ہوئے اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کیں۔ "ایسی کوئی بات نہیں سر۔"

"تو پھر........ آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے۔"

"کچھ نہیں سر........" آنسو جانے کہاں سے امڈ آئے روکنے کی کوشش بیکار ہوئی لیکن وہ جلدی سے بولی "سر دراصل میں پہلی بار نوکری کر رہی ہوں۔ اس سے پہلے مردوں سے........ تو کبھی واسطہ نہ پڑا تھا مجھے اچھا تو نہیں لگتا۔ لیکن میں کام کروں گی سر۔ آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤں گی........"

ندیم نے سگریٹ سلگایا........ اور کش لیتے ہوئے اسے گہری گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

ندیم کی ان نظروں کی تپش مینا نے چہرے پر محسوس کی ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔ نظروں سے نظریں ملتے ہی اس کی نظریں لڑکھڑا گئیں اس نے نچلے ہونٹ کا سرا دانتوں تلے دبا کر اپنے جذبات چھپانے کی کوشش کی۔

ندیم کو سوچوں کی اڑان جانے کہاں سے کہاں لے گئی۔

"مس ثمینہ۔" وہ خوابناک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی سوچوں میں الجھے الجھے بولا۔

"جی........ سر۔"

"آپ ملازمت کیوں کر رہی ہیں۔"

مینا کو ایک دھچکا سا لگا۔ جلدی سے اس نے ندیم کو دیکھا........ اور پھر آہستگی سے بولی........ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے سر........"

"او........ اچھا........" ندیم نے بے چین سی افسردگی سے کہا اور پھر سگریٹ کے لمبے لمبے کش بڑی بے صبری سے لیے اور چپ ہو گیا۔

"فرمایئے سر۔" چند لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد مینا سنبھل کر بولی

"کیا لکھوں۔ لیٹر لکھوا دیں........"

"مس ثمینہ۔" اس نے جیسے مینا کی آواز سنی ہی نہیں۔

"فرمایئے۔" اب مینا خود اعتمادی سے بولی

"کل سے آپ ہال میں نہیں بیٹھا کریں گی۔"

"جی........؟"

"ہاں میں نے فیصلہ کیا ہے"

"کیا سر؟"

"آپ کو اتنے بہت سارے مردوں میں بیٹھ کر کام کرتے واقعی اذیت ہوتی ہو گی۔"

مینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"کل سے آپ کی سیٹ اس برابر والے کمرے میں ہو گی۔" ندیم نے اپنے پیچھے انگوٹھے سے اشارہ کیا۔ پچھلا دروازہ غالباً کسی کمرے میں کھلتا تھا۔

"یہ میرا ریٹائرنگ روم ہے۔" ندیم نے کہا۔ تو مینا کا دل کچھ ہول سا کھا گیا۔

اس نے سر کے اشارے سے نہ کیا

"آپ کل سے یہاں بیٹھیں گی۔" ندیم بولا

"لیکن سر۔ یہ آپ کا ریٹائرنگ روم ہے۔"

"ہے تو۔۔۔۔۔۔۔"

"پھر میں یہاں۔۔۔۔۔۔۔۔"

ایک طرف آپ کی کرسی اور میز رکھ دی جائے گی۔ ٹائپ رائٹر بھی اور دوسری۔۔۔۔۔۔۔۔"

"لیکن سر۔۔۔۔۔۔۔۔"

"پریشان کیوں ہو گئیں۔۔۔۔۔۔۔۔"

"[illegible] ٹھیک ہوں سر۔"

"کیوں؟"

"بس"

مینا نے سادگی سے کہا۔ تو ندیم نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا چند لمحے تذبذب کے عالم میں رہا۔۔۔۔۔۔۔ مینا پر گھبراہٹ چھائی رہی۔ پھر ندیم نے سگریٹ کا کش لیا آہستہ آہستہ دھواں چھوڑتے اور نگلتے اس نے نیم وا نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے۔ لیکن عدم اعتمادی بھی تو نہ ہونی چاہیے۔۔۔۔۔۔۔۔"

"جی۔" گھبرا کر اس نے پھیلی پھیلی حیران نظروں سے ندیم کو دیکھا

وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے اسے دیکھ کر بولا۔۔۔۔۔۔۔۔"

آپ اس کمرے میں قسبتاً سکون سے کام کر سکیں گی۔"

مینا کا ذہن اب بھی اس آفر کو قبول نہ کر رہا تھا۔ ایک الگ تھلگ کمرے میں اکیلے بیٹھ کر کام کرنا وہ بھی اس حواس اور دل و دماغ پر چھائے ہوئے آدمی کے ساتھ؟؟؟

"نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔" اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

ندیم کرسی سے اٹھا۔

"آ[illegible] کمرہ دکھا دوں۔"

"لیکن سر۔"

"دیکھ تو لیں پہلے۔۔۔۔۔۔۔ ندیم نے پہلی بار سخت اور کھردرے لہجے میں کہا مینا ڈر گئی۔ پھر وہی نوکری چھننے کا سوال آنکھوں میں چبھنے لگا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی

"آئیے۔" وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔

مینا میز کے گرد گھوم کر اس کے قریب آگئی۔ اس نے ندیم کی طرف دیکھا۔ مضبوط حصار میں پناہ لینے کو اس کے اندر کی عورت مچل اٹھی ندیم نے دروازہ کھولا۔

"آئیے۔" اس نے مینا کے لیے راستہ بنا دیا۔

مینا دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ندیم بھی اندر آگیا۔

یہ کمرہ بھی ندیم کے آفس کی طرح شاندار تھا۔ نرم و گداز صوفہ سیٹ دبیز قالین اور ریشمی موٹے پردے بیرونی کھڑکی کے سامنے لگے تھے۔ کمرے میں دھیما دھیما اندھیرا تھا۔ ندیم نے کھڑکی کا پردہ کھینچ دیا۔ کمرہ چمچماتے سورج کی تیز روشنی سے بھر گیا۔ لیکن فضا خنک ہی تھی۔

"یہاں آپ کی سیٹ بن سکتی ہے۔" ندیم نے کھڑکی کے قریب کھلی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔

مینا ابھی تک رضا مندی ظاہر نہ کر سکی تھی۔ بہت مضطرب و بے چین دکھائی دے رہی تھی۔

"آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ نہ ہی کسی وسوسے کو ذہن میں جگہ دیں۔۔۔۔۔۔۔" وہ اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر کے بولا۔

وہ سر جھکا کر پاؤں سے قالین کو دبانے لگی۔

"مجھے کئی دنوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ آپ ہال میں ایزی فیل نہیں کر رہیں۔"

مینا نے مضطربانہ ندیم کو دیکھا۔

"آپ کو یہاں کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔"

"لیکن یہ آپ کا ریکارڈنگ روم ہے سر۔"

"ہاں۔"

"آپ نے ریسٹ کرنا ہوتا ہے۔"

وہ ہنس کر بولا۔ آپ کو فکر کیوں ہے۔ آپ پسند نہیں کریں گی تو میں یہاں نہیں آؤں گا۔"

نہیں سر۔ آپ کو تکلیف ہو گی۔"

"تو پھر تھوڑی یہاں بیٹھنے کی اجازت دے دیجئے گا۔"

وہ اس وقت باس ہونے کا احساس بھول چکا تھا۔ بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ مینا اندر ہی اندر سے اس بے تکلف اپنائیت پر کانپ گئی۔

"ٹھیک ہے؟" ندیم نے مینا سے پوچھا

مینا نفی میں جواب نہ دے سکی۔ آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بس تو کل سے یہاں آپ کام کریں گی۔ آپ کا سامان صبح یہاں لگوا دیا جائے گا۔"

"شکریہ سر۔"

"آپ اطمینان سے کام کر سکیں گی۔"

"واقعی...... میں ہال میں بہت پریشان ہوتی تھی۔"

ندیم نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ کر شوخی سے کہا "شائد اسی لیے غلطیاں کرتی تھیں۔"

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ آنکھوں میں حجاب کے سائے ڈول گئے گالوں پر سرخی لہرا گئی۔ اس نے محجوب نظروں سے ندیم کو دیکھا

"میں شرمندہ ہوں سر...... کوشش تو بہت کرتی ہوں۔"

"اب غلطیاں نہیں ہوں گی۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"احتیاط سے کام کیا کریں۔"

"شکریہ سر۔ کہ آپ میری غلطیاں درگزر کر دیتے ہیں۔"

"ہاں......" ندیم بے چینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا

مینا احسان مند نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اپنے قدموں پر گھوم کر اس کی طرف سے رخ موڑتے ہوئے بولا "مس ثمینہ...... میں آپ کی غلطیاں درگزر کر دیتا ہوں۔"

مینا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ شائد...... شائد ندیم اس کی وجہ بتانے کو تھا۔ یہ وجہ اس کی ذات میں دلچسپی بھی ہو سکتی تھی...... وہ دم روکے کھڑی تھی کہ بولا...... "صرف اس لیے درگزر کرتا ہوں کہ آپ کا نام ثمینہ ہے......"

مینا کا دل ڈوب ہی تو گیا۔ اس نے چیخ چیخ کر پوچھنا چاہا۔ کہ اس نام کی کمزوری کی وجہ کیا ہے ندیم۔

لیکن وہ کچھ نہیں بولی

ندیم نے قدرے رخ موڑ کر اسے دیکھا اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولا۔ "کبھی کبھی...... کچھ باتیں جو انسان کے لیے سنگدل حقیقتیں ہوتی ہیں...... دوسروں کو...... احمق پن کے سوا کچھ نہیں لگتیں......"

"جی؟" وہ آنکھیں پھیلائے اسے تکتے ہوئے بولی

ندیم نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور جیسے اسے اپنے اور مینا کے باس اور ماتحت کے رشتے کا احساس ہو گیا وہ خوابوں اور سوچوں کی دنیا سے نکل آیا تھا۔ قدم اٹھاتے ہوئے بولا...... "آیئے مس ثمینہ میں آپ کو لیٹر لکھوا دوں......"

"بہتر۔" مینا سوچوں میں ابھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل کر آفس میں آ گئی

اور اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔

ندیم الماری کھول کر فائلیں نکالنے لگا۔ پھر ایک فائل لے کر اپنی کرسی پر آ

بیٹھا اور کاغذات الٹنے پلٹنے میں مصروف ہو گیا۔

مینا کے من میں ہلچل مچی تھی۔ وہ اب بھی سوچ رہی تھی کہ ثمینہ نام ندیم کے لیے کیوں اتنا اہم ہے...... وہ اس لڑکی کے متعلق بھی سوچنے لگی۔ جو ندیم کی دوست تھی اس کا نام بھی تو ثمینہ ہی تھا

دماغ پر زور دینے کے باوجود اسے کچھ سمجھ نہ آیا

ندیم اب فارم میں آ چکا تھا۔ وہ معتبر سا باس بنا بیٹھا تھا۔ جس کے چہرے پر ملائمت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بڑی بارعب سنجیدگی سے وہ مینا کو لیٹر ڈکٹیٹ کروانے لگا۔

مینا کی ساری چیزیں چپراسی نے افس سے ملحقہ ریٹائرنگ روم مین رکھ دیں جب وہ ہال سے چیزیں اٹھا رہا تھاتو ہیڈ کلرک اور دو تین دوسرے کلرک آ چکے تھے ناصر نے چپراسی کو چیزیں اٹھاتے دیکھا تو حیرانگی سے بولا کیا مس ثمینہ نے کام چھوڑ دیا

حامد بھی جلدی سے ادھر آ کر بولا۔ "کیوں اٹھا رہے ہو یہ چیزیں۔"

اصغر بھی آیا ہوا تھا "بھئی یہ مس ثمینہ کی سیٹ ہے...... سامان کیوں اٹھ رہا ہے۔"

چپراسی سب کی باتیں سن کر مسکرایا اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا......

"مس ثمینہ صاحبہ کی ترقی ہو گئی۔"

"کیا؟" تقریباً سبھی بولے

"بھئی ان کا سامان ریٹائرنگ روم میں جا رہا ہے۔" وہ ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں بولا

یہ موضوع باقی لوگوں کے آنے پر کافی زیر بحث رہا...... اور جب وقت مقررہ پر مینا کام پر آئی۔ تو سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں نظروں کی تندی اور تیزی اس نے بھانپ لی۔ پہلے تو اسے پتہ نہ چلا کہ وہ نظروں کا یوں مرکز کیوں بنی ہے۔ حیران حیران سی آگے بڑھی

"مس ثمینہ صاحبہ......" ناصر نے اسے پکارا

"جی؟"

"آپ کی ترقی ہوئی ہے۔"

"میری ترقی؟"

"ہاں۔" حامد نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا

"نہیں......... ابھی مجھے کام کرتے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔"

"جی یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے ہم لوگ برسوں سے یہیں سڑ رہے ہیں اور آپ......... ایک ہی جست میں ہال سے ریٹائرنگ روم میں پہنچ گئیں۔"

اس کی بات پر کچھ لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ طنزو تمسخر بھرا قہقہہ۔

مینا ششدر سی کھڑی رہ گئی......... اس کے چہرے پر کہر سی چھا گئی۔ سارا وجود کانپ گیا۔ اس پر دبی دبی آوازوں میں کچھ اور لوگوں نے بھی آوازے کسے۔ یہ آوازے اس کی سماعت پر ضرب کاری کی طرح لگے.........

اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ ہونٹ کانپنے لگے......... اور بیچارگی سے ڈبڈبائی آنکھوں سے وہ ان لوگوں کو دیکھنے لگی۔

"ثمینہ باجی" اصغر جلدی سے اٹھ کر آیا۔ "آپ اندر چلی جائیں۔ آپ کی سیٹ ریٹائرنگ روم میں لگائی گئی ہے۔"

"اصغر بھائی۔" وہ بمشکل آنسو روکتے ہوئے بولی "میں نے پہلی دفعہ نوکری کی ہے۔ ہال میں سب مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کام کرتے ہوئے جھجک آتی تھی۔ ندیم صاحب نے میرے لیے الگ بیٹھنے کا بندوبست کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ جائیں۔"

مینا کی بات پر ناصر حامد اور اس کے ساتھی ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے کو بڑے فحش انداز میں اشارے کر رہے تھے۔

مینا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اصغر کو بے چاری لڑکی پر بڑا ترس آیا۔ وہ اسے دوسرے دروازے سے ریٹائرنگ روم تک لے آیا۔

"باجی آپ نے کام کرنا ہے تو دل بھی بڑا کرلیں۔ ایسی ایسی باتیں سننا پڑیں گی

ہی۔ لیکن آپ اپنے کام سے سروکار رکھیں۔ ان باتوں پر دھیان نہ دیں۔

اصغر کو تشکر نگاہوں سے دیکھتی وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی چپراسی نے کھڑکی کے قریب کھلی جگہ پر اس کی کرسی میز اور ٹائپ رائٹر وغیرہ رکھ دیا تھا۔

وہ اپنی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ وہ ان لوگوں کی باتوں اور طنزو تمسخر سے بہت اپ سیٹ ہو رہی تھی۔ کرسی کی پشت پر گردن ڈالتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

حامد اور ناصر کی باتیں اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتری تھیں۔ ان باتوں کی اذیت نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

اف اس نے ایسی باتیں کب سنی تھیں کبھی

لیکن یہ کیسا وقت آگیا تھا۔ مجبوری نے اسے کہاں سے کہاں لا ڈالا تھا۔ لوگ اسے کیا سمجھنے لگے تھے۔

اسے اپنی بے بسی اور مجبوری پر رونا آنے لگا......... میز کے بازو کے حلقے میں سر رکھ کر وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

"ہیلو مس ثمینہ۔" ندیم کی آواز پر مینا نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

"نیند آ رہی تھی صبح صبح" وہ خوشدلی سے مسکرایا۔ لیکن دوسرے لمحے حیرانگی سے مینا کو دیکھنے لگا۔ جو اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور قدرے رخ موڑے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

"کیا ہوا مس ثمینہ........." وہ دو قدم بڑھا کر اس کے سامنے آگیا

مینا نے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے سر اور جھکا لیا

"آپ.........؟" وہ حیرانگی سے اسے تکتے ہوئے بولا "آپ رو رہی ہیں........."

مینا نے اسی انداز میں کھڑے کھڑے سرنفی کے طور پر ہلایا

"کیا بات ہے۔" اس نے سنجیدگی سے پوچھا

"کچھ نہیں۔"

"نہیں......... نہیں تو۔"

"حد ہو گئی........ رو بھی رہی ہیں اور انکار بھی کیے جا رہی ہیں........"

مینا کے آنسو اس کے بس میں نہ رہے اس نے قدرے گھوم کر چہرہ ندیم سے چھپا لیا۔

"مس ثمینہ........" وہ قدرے رعب سے بولا

"جی"

"بتاتی کیوں نہیں ہیں........"

"کچھ نہیں سر۔"

"کچھ ہے........"

"نہیں........ بس........ یونہی........"

"یونہی رونے کو جی چاہا........ ہوں........ صبح صبح........ دفتر آتے ہی رونے کو جی چاہنے لگا........"

اس نے رک رک کر کہا۔ مینا کچھ نہیں بولی

ندیم کے ذہن میں اک شعلے کے لپکے کی طرح خیال آیا کہ مینا کو ہال میں کسی نے کچھ کہا ہو گا۔ ان لوگوں کی ذہنیت سے اسے آگہی تھی سیٹ کی تبدیلی پر ضرور ان لوگوں نے کچھ تبصرہ کیا ہو گا۔

"مس ثمینہ۔" اس نے پھر رعب سے پکارا۔

مینا نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی

"کیا بات ہے؟"

"سر"

"میں یہاں نہیں بیٹھوں گی۔"

"کیوں"

"ہال ہی میں ٹھیک ہے۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ندیم کا قیافہ غلط نہیں تھا۔ اس کے غصے کا پارہ چڑھنے لگا۔

"ہوں........ ان لوگوں نے آپ سے کچھ کہا ہے۔"

وہ........ وہ سر........ میں۔"

"آپ........ بہت بزدل لڑکی ہیں۔" ندیم اس پر اک نگاہ ڈالتے ہوئے ہال میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا اس کے تیور بدل گئے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اور آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں تھیں۔

مینا سمجھ گئی۔ کہ وہ ہال میں لوگوں پر برسنے کے لیے جا رہا ہے۔ برق کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں کئی خیال آئے۔ ندیم نے ان لوگوں کو ڈانٹ پلائی تو وہ اور بھی اس کے خلاف ہو جائیں گے پھر ان لوگوں کی زبانیں دفتر میں تو شائد بند ہو جائیں۔ لیکن باہر کون بند کرے گا۔ وہ کیا کچھ نہ کہتے پھریں گے۔ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ رسوائی اور بدنامی کے خوف سے وہ کانپ گئی۔

اور

پیشتر اس کے کہ ندیم کا ہاتھ ہینڈل پر پڑتا

وہ دوڑ کر دروازے کے قریب آ گئی........ ندیم نے اپنے بالکل قریب کھڑی مینا کو دیکھا۔

"سر" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

"کیا ہے؟" ندیم نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا

"آپ ان لوگوں سے کچھ نہ کہیں۔"

یہ میرے دفتر کے ڈسپلن کا معاملہ ہے۔" وہ سختی سے بولا

"میں ڈسپلن کی خلاف ورزی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"سر پلیز........" وہ جل تھل آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

ندیم ایک لحہ کو ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

"سر پلیز......... اگر آپ نے ان لوگوں کو ڈانٹا ڈپٹا تو یہ اور بھی میرے خلاف ہو جائیں گے۔ باتیں بنائیں گے......... میں......... میں نہیں چاہتی کہ ان لوگوں کے لیے اک موضوع بن جاؤں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ یہ آنسو بھی عجیب ہی شے ہیں۔ بہنے پر آ جائیں تو یوں بہیں گے جیسے بند ہی ٹوٹ گئے ہوں۔ اور کبھی خشک ہو جائیں گے تو رونے کی ہر کوشش اور جتن کو بیکار کر دیں گے۔

ندیم اس کی پوزیشن سمجھ گیا۔ آہستہ آہستہ اپنے قدموں پر قدرے پیچھے ہٹ گیا۔ مینا دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی

"مس ثمینہ........." ندیم نے اسے پکارا

"لیں سر" ثمینہ نے جلدی جلدی آنکھیں پونچھ ڈالیں اس کا چہرہ شبنم سے دھلے گلاب کی طرح لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی اور ہونٹوں پر بھیگا پن تھا......... ندیم نے اسے گہری گہری نظروں سے دیکھا

"اپنی سیٹ پر آ جائیے........."

مینا چند لمحے تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی......... پھر آہستگی سے بولی "میں کام نہیں کروں گی سر"

"کیا........." وہ جیسے چونک کر بے ساختگی سے بولا۔

"سر......... میں کام نہیں کروں گی......... میں لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتی......... بہتر یہی ہے کہ کام چھوڑ دوں........."

"آپ کام نہیں چھوڑیں گی۔" ندیم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو مینا اس کا منہ تکنے لگی۔

"آپ کی یقیناً کوئی بہت بڑی مجبوری ہے جو آپ ملازمت کر رہی ہیں۔" ندیم نے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر کہا......... "یہ ملازمت چھوڑ کر آپ کو پھر ملازمت کے لیے سرگرداں ہونا پڑے گا........."

مینا نے شکست خوردگی سے سر جھکا لیا

"ہر دفتر میں آپ کو ایسے ماحول ہی سے واسطہ پڑے گا۔ لوگوں کی ذہنیت کو آپ بدلنے سے رہیں........."

وہ بے چین بے چین نظر آئی

"ہمت سے کام لیں۔ آپ اچھے کردار کی لڑکی ہیں بزدلوں کی طرح ہتھیار نہیں ڈالنا چاہیے........."

وہ چند لمحے رکا

پھر

جیسے حکم دیا۔ "چلیں کام شروع کریں۔ کل والے کاغذات ٹائپ کر کے مجھے دے دیں......... گھنٹے کے اندر اندر یہ کام ختم ہو جائے"

وہ دوسرا دروازہ کھول کر اپنے آفس میں چلا گیا

مینا چند لمحے تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی......... یوں لگ رہا تھا۔ جیسے دوراہے پر کھڑی فیصلہ نہ کر پا رہی ہو۔ کہ اس کا قدم کس رخ اٹھنا چاہیے۔

لیکن

جلد ہی اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ اک عزم اور ہمت اپنے وجود میں محسوس کرتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف بڑھی

اسے ملازمت کرنا ہی تھی۔ تو اس قسم کی باتوں کا عادی بھی ہونا تھا حامد اور ناصر جیسے لوگوں سے جرات سے ہی نپٹا جا سکتا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ یہاں بیٹھ کر وہ ان کی باتیں تو نہ سنا کرے گی وہ اپنے کام سے کام رکھے گی۔

اس نے کاغذات نکالے......... ٹائپ رائٹر کو ٹھیک جگہ پر رکھا اور کام کرنے لگی وہ اب مطمئن اور پرسکون نظر آ رہی تھی۔

"مینا"

"جی امی۔"

"آج........"

"کیا ہوا آج........"

"آج میں........ بازار گئی........"

"وہ تو ان چیزوں سے ظاہر ہے جو آپ خرید کر لائی ہیں........"

"بازار گئی........ واپسی پر........"

"کیا ہوا واپسی پر........؟"

مینا اپنے پلنگ پر چوبی تکیے کے ساتھ سر ٹکائے کوئی دلچسپ کتاب پڑھ رہی تھی........ ابھی ابھی امی بازار سے آئی تھیں۔ خریدا ہوا سودا سلف اٹھائے وہ کمرے میں آ گئی تھیں........ چھوٹے موٹے لفافے اور تھیلے کرسی کے قریب زمین پر رکھتے ہوئے وہ خود کرسی میں جیسے گر پڑی تھیں۔ مینا نے اک نظر انہیں دیکھا تھا۔ پھر کتاب پڑھنے لگی تھی

امی چند لمحے پریشان پریشان سی بیٹھی رہی تھیں۔ پھر انہوں نے بیٹی کو مخاطب کیا تھا لیکن جو کچھ کہنا تھا کہہ نہ پا رہی تھیں۔ الجھی الجھی سی بیٹھیں تھیں۔

مینا نے امی کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ کتاب ایک طرف الٹی رکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ ماں کو غور سے دیکھا پھر ان کے قریب آ کر بولی

"کیا ہوا امی........

وہ سر کو کبھی نفی اور کبھی اثبات میں جنبش دے کر ہاتھوں کو بھی اسی انداز میں حرکت دے کر رہ گئیں۔

ان کی اس حرکت سے مینا بھی پریشان ہو گئی۔ کندھے سے ہو کر سینے پر لٹک آنے والی چوٹی کے آخری سرے کو بل دیتے ہوئے اس نے قدرے جھک کر ماں کو دیکھا۔

"کیا بات ہے امی........ کچھ بتائیں بھی........"

"پتہ نہیں آنکھوں نے دھوکہ کھایا ہے........ یا حقیقت میں وہی تھا؟"

"وہی کون؟" مینا کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ وہ ماں کے قدموں کے پاس ہی دری پر بیٹھ گئی۔

امی کشمکش و پیچ میں تھیں۔ مینا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور پھر ان کا گھٹنا پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولی "کون امی؟"

"اشرف........" امی نے اس کے سر پر اپنا کانپتا ہاتھ رکھ دیا

"اشرف؟" وہ جیسے چیخ اٹھی

"ہاں لگتا تو وہی تھا........" ماں نے بڑے دکھ سے کہا "ہو سکتا ہے میری نظروں نے دھوکہ کھایا ہو........ وہ نہ ہو کوئی اور ہی ہو........"

"کہاں دیکھا آپ نے اسے........" اس کا دل خوفناک تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"میں واپس آ رہی تھی........ رکشے میں تھی........ مخالف سمت سے اک گاڑی گزری........ جھلک ہی نظر آئی........ وہی لگا مجھے........"

مینا زمین پر سے اٹھ کر برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی اسے اپنا وجود سیسے کا لگ رہا تھا........ اتنا بوجھل ایسا بھاری کہ بمشکل اپنے آپ کو گھسیٹ کر کرسی تک لا سکی۔ چند لمحے ماں بیٹی چپ رہیں ماں کی نظروں میں ماضی کے کئی روشن روشن دن تھے۔

اور مینا کی آنکھوں میں ماضی کا اندھیرا در آیا تھا۔ ماضی حال مستقبل اندھیرا ہی اندھیرا تھا اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ سخت مضطرب اور بے چین ہو کر اس نے کرسی کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اگر آج وہ اشرف ہی تھا......... تو......... دو سال پہلے میری ممانی نے ضرور سے دیکھا ہو گا۔"

"امی........." مینا بے چارگی سے بولی

ہوں........."

"کیا آپ کو یقین ہے کہ اشرف........."

"یقین ہوتا تو چاہیے کیا تھا۔ شہر میں اسے ڈھونڈ نکالنا مشکل نہ تھا........."

"اوہ........."

اسی لیے تو شش و پنج میں ہوں........."

"وہ......... نہیں ہو گا امی........."

"شائد........."

چند لمحے پھر خاموشی رہی۔ پھر امی نے آہستہ آہستہ سر ہلایا اور بڑے یقین سے بولیں "میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ ہمیں ضرور ملے گا........."

مینا نے ایک نگاہ امی پر ڈالی۔ یہ نگاہ بڑی دلفگار تھی......... پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "امی وہ آپ کے ذہن سے ابھی تک نہیں نکلا اس لیے آپ کو نظر آ گیا........."

ماں نے اذیت بھری نظر بیٹی پر ڈالی......... پھر بولیں.........

ممانی ساجدہ نے بھی تو دو سال پہلے اسے دیکھا تھا........."

"خدا جانے دیکھا تھا......... یا دھوکہ کھایا تھا اس پر........."

"نہیں بیٹی......... اب وہ اتنی نادان بھی تو نہیں......... ہوائی اڈے پر دیکھا تھا اسے......... ان کی فلائیٹ کا وقت ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کے قریب

جا سکیں۔ وہ بھی انہیں دیکھ نہ پایا۔ بھیڑ اور وقت کی تنگی نے کام خراب کیا........."

مینا نے ایک گہری سانس لی اور بولی......... "مجھے ممانی کی بات کا یقین نہیں........."

"نہیں بیٹے۔"

یقین ہے تو پھر وہ ہماری ہمدرد اور خیر خواہ نہیں۔ انہیں وہ نظر آیا تھا۔ تو اس سے ملنا بھی چاہیے تھا......... ہمارا پتا دینا چاہیے تھا........."

"بھئی اس کی فلائیٹ جا رہی تھی......... وہ جہاز کی طرف جا رہی تھیں......... اور اشرف کو انہوں نے جنگلے کے باہر دیکھا تھا........."

"فلائٹ کو جانے دیتیں......... کیا انہیں پتہ نہیں تھا......... کہ اشرف سے ملنا کتنا اہم ہے۔"

"اور اس غلطی کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں........."

امی نے پریشان ہو کر بیٹی کو دیکھا......... وہ تلخی سے مسکرائی۔

"ہاں امی......... انہوں نے اشرف کی اطلاع ہمیں دے دی......... احساس دلا دیا کہ وہ ہے......... بس........."

ماں نے ایک گہری سانس لی۔

مینا ہنس پڑی......... لیکن یہ ہنسی کھوکھلی اور بے جان تھی.........

"امی........."

"ہاں........."

اشرف کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو جھلک دکھا کر غائب ہو کر احساس دلا دیتا ہے......... کہ وہ یہیں کہیں ہے........."

ماں نے دکھ سے بیٹی کو دیکھا۔ جو مسکراتے ہوئے بھی روتی لگ رہی تھی۔

"یہ بات تو ہے" ماں بولیں

"اور یہی بات ساری پریشانیوں کا سبب ہے سات سال ہو رہے ہیں........."

"ہاں......."

"کاش وہ مرگیا ہوتا....... یا ہم......."

"اللہ نہ کرے۔" ماں نے جلدی سے مینا کے منہ کے آگے ہاتھ رکھ دیا۔

"مصیبت تو ختم ہو جاتی......." وہ بے رحم تلخی سے بولی....... "ہمارے نصیب ہی......."

امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مینا کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بڑے پیار سے بولی۔

"امی....... رونا دھونا نہیں....... ہماری یہی قسمت تھی....... بس....... آپ ہر قسم کا تردد دل سے نکال دیں۔ انتظار کی شمع بھی گل کر دیں....... کہ کوئی نہیں....... کوئی نہیں آئے گا......."

"کیسے کر دوں مینا......."

"اس لیے کہ اس کے سوا چارہ بھی نہیں"

"مجھ سے تیری سلگتی جوانی نہیں دیکھی جاتی" امی بے اختیار ہو کر رونے لگیں۔ جی تو مینا کا بھی بھر آیا۔

لیکن

اس نے صبر و تحمل سے کام لیا۔

چند لمحے امی آنسو بہاتی رہیں....... پھر آنچل سے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں "مجھے کیا پتہ تھا......."

"کسی کو بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا امی....... مستقبل کی باگ ڈور قسمت کے ہاتھ میں ہوتی ہے....... اور یوں آپ کی طرح رونے دھونے سے بھی کچھ نہیں ہوتا....... نوشتہ تقدیر کو صبر شکر کے ساتھ جھیلنا چاہیے۔"

"جھیل تو رہے ہیں......."

مینا ہنس پڑی....... پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولی "آپ نے تو اسے سوز جان

بنا رکھا ہے۔"

"تو کیا کروں۔"

"کچھ بھی نہیں....... وقت گزر رہا ہے گزرتا چلا جائے گا۔"

امی نے سر جھکا لیا۔ ان کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے مینا چند لمحے چپ چاپ انہیں تکتی رہی۔ پھر کرسی کے ہتھے پر بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے۔

"امی۔" اس نے پیار سے پکارا

"جی" وہ آہستگی سے بولیں

"ایک بات بتائیں۔"

"کیا؟"

"اس طرح دکھی ہو کر آپ کچھ کر سکتی ہیں۔"

"کیا کر سکتی ہوں......."

"جب کچھ نہیں کر سکتیں....... تو پھر دکھی ہونے سے فائدہ......."

"یہ کوئی اپنے اختیار میں ہے......."

"ہے......."

"ہونہہ......."

سوچ کا انداز بدل ڈالیں۔ جب ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ تو پھر رونے دھونے اور خود کو دکھ و اذیت میں مبتلا رکھنے سے فائدہ......." وہ کافی دیر ماں کو تسلی دیتی رہی....... اس کی باتیں معقول تھیں امی کو قائل ہونا ہی پڑا....... ان کے آنسو تھم گئے تھے....... لیکن قائل ہونے کے باوجود وہ آج کے واقعے کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ رکشے میں بیٹھے انہوں نے بالکل قریب سے گزرنے والی بڑی سی گاڑی میں جیسے دیکھا تھا۔ وہ بالکل اشرف تھا....... وہی شکل و صورت وہی رنگ....... بال بھی اسی کی طرح تھے۔

لیکن یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ وہی تھا۔ سات سال میں کئی تبدیلیاں بھی آ سکتی تھیں۔

سوچتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھیں......... لفافے اور تھیلے اٹھائے دروازے سے نکل کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد مینا پلنگ پر آڑی لیٹ گئی......... اس کے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ امی کی باتوں نے اس کے سکون کو متلاطم کر دیا تھا۔ اگر واقعی امی نے اشرف کو دیکھا تھا

تو

تو

وہ گھبرا گھبرا کر سوچنے لگی

اور

سوچوں کے سمندر میں غوطے کھاتے کھاتے وہ ندیم تک پہنچ گئی۔ ندیم جو اس کے حواس۔ دل و دماغ پر اپنی پوری قوت اور طاقت سے چھا گیا تھا۔ جس کی قربت میں وہ سیال شے بن کر بہہ جاتی تھی۔ اپنے آپ کا ہوش ہی نہ رہتا تھا جیسے.........

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی......... اسے وحشت سی ہونے لگی

اف اسے ندیم کے متعلق اس انداز میں سوچنے کا کیا حق تھا۔ اس سے محبت کرنے کا کیا اختیار تھا

لیکن

لیکن

وہ ایسا نہ کرے۔ یہ بھی تو اس کے اختیار میں نہ تھا۔

وہ کیا کرے۔؟

کیا کرے؟

دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وہ گھبرا کر سوچنے لگی۔

مینا میز پر جھکی کام میں مصروف تھی کہ چپراسی اندر آیا۔ وہ اپنے ہی کسی کام سے اندر آیا تھا

"رحمت دین" مینا کے کام کرتے ہاتھ رک گئے اس نے چپراسی کی طرف دیکھا

"جی صاحب" وہ مودبانہ بولا

"سنو" اس نے کہا

"جی۔" رحمت دین بولا

"رحمت دین......... مینا کچھ کہتے کہتے ہچکچائی۔

"کیا بات ہے مس صاحب" اس نے کہا

"دیکھو۔"

"جی۔"

"صاحب دوپہر کو آرام کہاں کرتے ہیں بریک میں پہلے تو اس کمرے میں آ جایا کرتے تھے نا"

"آفس ہی میں جی۔ کرسی پر ہی بریک کا وقت گذار لیتے ہیں۔ یا کبھی باہر چلے جاتے ہیں۔"

"چائے وغیرہ بھی وہیں پیتے ہیں۔"

"ہاں جی......... دس گیارہ بجے چائے منگوا کر پیتے ہیں ٹھنڈا پینا ہو تو وہ بھی وہیں منگوا لیتے ہیں۔"

"ہوں۔"

"بس یہی پوچھنا تھا مس صاحب۔"

"ہاں...... میرے یہاں بیٹھنے سے انہیں خاصی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

"رحمت دین نے سرہلایا...... وہ تو ہوگی ہی۔ صاحب گھنٹہ آدھ گھنٹہ ضرور اس کمرے میں رہتے تھے بعض دفعہ تو اس سے بھی زیادہ دیر...... کام بھی یہیں بیٹھ کر کرتے تھے...... اور جب......" چپراسی کچھ کہتے کہتے رکا

"اور جب کیا......؟ ...... رحمت دین"

رحمت دین نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے شوخی سے بولا جب ان کے دوست وغیرہ آتے تھے۔ تب بھی اس کمرے میں بیٹھتے تھے"

"دوست وغیرہ" کے الفاظ پر وہ آنکھیں شوخی سے گھما رہا تھا۔ مینا پہلے تو کچھ نہیں سمجھی۔ اس کے وضاحت طلب کرنے سے پہلے ہی وہ بولا۔ "صاحب کو ملنے مس ثمینہ آتی تھیں۔ تو اس کمرے میں بیٹھا کرتی تھی"

"کیا وہ ہر روز آتی تھیں۔" وہ جلدی سے بولی

"نہیں ...... کبھی کبھی ہفتے میں اک آدھ دن ...... وہ بھی گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے۔ صاحب جب بہت مصروف ہوتے ہیں ...... اور ان کے ساتھ جا نہ سکتے ہوں ......"

"کیسی لڑکی ہے وہ ......" مینا نے تجسس سے پوچھا

"ایک دم میم صاحب" وہ بولا

"بہت خوبصورت ہے۔" مینا کے لبوں سے نکلا

"جی بہت......" چپراسی جیسے تصور ہی تصور میں مس ثمینہ کو دیکھ رہا تھا۔

"اچھا" مینا کے لبوں سے مری سی آواز نکلی

"گٹ پٹ انگریزی بولتی ہیں...... لونڈا لگتی ہیں لونڈا ...... ہمیشہ دوپٹے کے بغیر آتی ہیں ......" وہ مزے لے لے کر بولا۔" بڑی فیشن ایبل ہیں ......"

"مینا نے سریونہی ہلا دیا

رحمت دین تجسس سے بولا "آپ نے انہیں نہیں دیکھا۔"

"نہیں......"

"آئی تو تھیں ...... پر آفس میں آکر ادھر ہی سے صاحب کو لے کر چلی گئیں تھیں"

"کب؟"

"کوئی آٹھ دس دن ہو گئے ہوں گے...... اب آئیں نا۔ تو آپ کو بتاؤں گا......"

مینا نے پھر سرہلایا۔

رحمت دین کچھ اور کہنے کو تھا کہ وہ بولی "اب جاؤ رحمت دین مجھے کام کرنے دو ......"

"اچھا صاحب" وہ کمرے سے نکل گیا۔

رحمت دین کے جانے کے بعد مینا نے اپنا دھیان کام کی طرف لگا دیا۔ لیکن اس کے کانوں میں رحمت دین کی باتیں گونج رہی تھیں۔ بہت خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکی کا پیکر وہ اپنے ذہن میں تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہوئے سوچوں میں گم تھی۔ اس ان دیکھی لڑکی سے اسے رقابت محسوس ہو رہی تھی۔ جو آفس میں آکر ندیم کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ جس سے شامیں اکٹھی گزارنے کا پروگرام ندیم فون پر بناتا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھنے کی خواہش وہ شدت سے محسوس کرنے لگی۔

اپنے آپ سے وہ کچھ دیر الجھتی رہی۔ پھر کرسی سے اٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ذرا سا پردہ ہٹا کر وہ باہر دیکھنے لگی۔ بازار کی رونق اور سڑک کی گہما گہمی بھی خیالات کی یورش کی روش نہ بدل سکی۔ وہ وہاں سے ہٹی اور باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور بیسن کے اوپر لگے چوڑے آئینے میں اپنا آپ دیکھنے لگی۔ اس نے ہر زاویے سے اپنے چہرے کو دیکھا وہ کسی طور اپنے آپ کو حسین نہ مان سکی۔ بس چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں تھیں۔ جنہیں وہ خوبصورت کہہ سکتی تھی۔

پھر معاً اسے خیال آیا۔

اسے بھی میک اپ کر کے آنا چاہیے۔ بالوں کو بھی جدید انداز میں سنوارنا چاہئے۔ آخر وہ بھی جوان ہے شکل و صورت بھی بری نہیں میک اپ سے تو برے چہرے بھی بھلے لگنے لگتے ہیں پرکشش ہو جاتے ہیں۔ سادہ سا دھلا دھلایا چہرہ بھی کوئی جاذبیت رکھتا ہے جیسے ہر وقت سوگوار سی کیفیت ہی چھائی رہتی ہو۔ ایسے چہرے بھی کسی کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں۔

وہ منہ کے آڑے ترچھے زاویے بناتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ کل سے وہ بھی میک اپ کر کے بالوں کو نئے نئے انداز سے سنوار کے آیا کرے گی۔

یہ فیصلہ کر کے وہ پلٹی

اور

پلٹتے ہی سوچیں بھی پلٹ گئیں۔ اپنی مضحکہ خیز سوچوں پر اسے ندامت سی محسوس ہوئی .... اور وہ سر جھکائے جلدی سے اپنی سیٹ پر آ بیٹھی .... وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھی .... سرزنش کر رہی تھی۔ اسے کیا ہوتا جا رہا تھا....... اس بات سے خوفزدہ تھی.......

لیکن

بے بس ہو کر اس نے سر بازو کے حلقے میں رکھ دیا .... وہ کیا کرے .... ندیم اس کے لئے اتنا بڑا چیلنج تھا۔ وہ اس کے متعلق نہ چاہتے ہوئے بھی سوچتی رہتی تھی....... وہ اس کے حوالے سے مس ثمینہ سے بھی رقابت محسوس کر رہی تھی۔

اسے یہ سب کچھ کرنے کا حق نہیں تھا۔ اجازت نہیں تھی۔ اختیار نہیں تھا....... پھر بھی .... پھر بھی .... وہ بالکل بے بس تھی۔

وہ جانے کب تک کھوئی رہتی کہ بیل کی آواز پر چونک کر سنبھلی۔ جلدی جلدی

کاغذ اکٹھے کئے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ندیم نے اسے بلایا تھا۔

ندیم کسی سے فون پر مصروف گفتگو تھا۔ کوئی بزنس کی بات تھی امپورٹ کیا ہوا مال کراچی پہنچ گیا تھا۔

وہ فون ختم ہونے کے انتظار میں کھڑی تھی کہ باتیں کرتے ہوئے ندیم نے اس کی طرف دیکھا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی .... اس نے کئی بار چپکے چپکے ندیم کو دیکھا وہ اسے کتنا اپنا لگ رہا تھا .... یہ بات محسوس کر کے وہ ڈر گئی۔

فون ختم کر کے ریسیور رکھ دیا .... وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"ہاں تو مس ثمینہ ...." وہ اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا مینا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا

"آپ کھڑی کیوں رہتی ہیں بیٹھ جایا کریں ...." وہ جیسے گنگنا رہا تھا۔

"اچھا سر......." اس نے مشینی انداز میں سر جھکا کر جواب دیا۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔" ندیم نے جیسے یونہی کہہ دیا

"کیوں سر" اس نے بے دھڑک پوچھا۔

"فرم کو بہت بڑا آرڈر ملا ہے۔ جرمنی کی فرم سے بات چیت چل رہی تھی۔ آج ہمارے نمائندے نے آرڈر کنفرم کر دیا ہے۔"

مینا نے خوشی کا اظہار ایک خوبصورت مسکراہٹ سے کیا۔

چند لمحے ندیم اسی آرڈر اور اس کی سپلائی کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ یہ باتیں اس کے لئے غیر متعلقہ تھیں۔ لیکن وہ اسے بتائے جا رہا تھا۔ اور وہ اس کی بھاری مردانہ آواز کے سحر میں ڈوبی سنے جا رہی تھی۔

جب وہ چپ ہوا۔ تو مینا آہستگی سے بولی" آپ نے مجھے بلایا تھا سر۔"

"اوہ ہاں۔ ایک خط ابھی ٹائپ کرنا ہے۔"

"لکھوا دیں"

"لکھا رکھا ہے بس جلدی سے ٹائپ کر دیں۔"

"لائیے"

ندیم نے فائل سے ایک ہاتھ سے لکھا خط نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لیجئے۔"

خط لے کر مینا اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا ...... "خط جلدی چاہئے ...... لیکن جلدی میں اسے غلطیوں کا پلندہ نہ بنا لائیے گا......"

""مینا شرمندہ سی ہو گئی۔ پھر جاتے جاتے بولی" اب تو غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں......"

"پھر بھی ہوتی تو ہیں......"

"آج نہیں ہوں گی۔"

"نہ ہوئی تو نوازش ہو گی۔"

وہ ہنس رہا تھا...... مینا کو جاتے جاتے کرسی پر گھومتے ہوئے دیکھ بھی رہا تھا۔

"اس کے جانے کے بعد ندیم نے سگریٹ سلگایا۔ اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد مینا خط ٹائپ کر کے لے آئی اور کھڑے کھڑے کاغذ ندیم کے سامنے رکھ دیا۔

ندیم نے خط پڑھا...... واقعی آج اس نے سب ٹھیک ٹائپ کیا تھا۔
مسکراتے ہوئے بولا "شاباش...... آج تو آپ نے کمال کر دیا ......"

"شکریہ" وہ خوش ہو گئی

"مینا اس کے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھ گئی۔ ندیم نے بیل بجائی۔
حمید اندر آگیا۔ اس نے کچھ ضروری باتیں اس سے کہیں اور ٹائپ شدہ کاغذ اسے دے دیا

"ابھی ڈسپیچ کروا دیں۔" ندیم نے کہا۔

"بہت اچھا" حمید نے اک اچٹتی سی نگاہ مینا پر ڈالتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

ندیم نے پھر بیل بجائی اور اب رحمت دین اندر آگیا

"حکم جناب" وہ بولا

"چائے لاؤ"

"بہتر"

"دوسری پیالی بھی لانا"

"اچھا جی"

رحمت دین نے مینا پر نگاہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔ دوسری پیالی کے آرڈر پر مینا نے گھبرا کر ندیم کو دیکھا۔

ندیم اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کئی لمحے گزر گئے

"میں ......" مینا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا

"کیا؟" وہ قلم چھوڑ کر بولا

"بیٹھئے...... چائے منگوائی ہے۔ پی کر جائیے گا۔"

"نہیں سر...... شکریہ"

"کیوں؟"

"وہ چپ رہی

"چائے پسند نہیں آپ کو"

"اس وقت شائد آپ پیتی بھی ہیں۔"

"جی۔"

"میں وہیں منگوا کر پی لوں گی۔"

"یہاں میرے ساتھ پینا پسند نہیں"

مینا نے اک لمحہ کو ندیم کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ٹھوس سی سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ کچھ غیر محسوس سی برہمی بھی تھی۔

"یہ بات نہیں سر۔" مینا بمشکل کہہ سکی......... وہ چند لمحے اسے تکتا رہا۔ پھر بولا۔ "بہتر......... آپ جا سکتی ہیں........."

مینا کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ ندیم کچھ کچھ ناراض نظر آ رہا تھا۔ اور اس کی ناراضگی مینا کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ ندیم سر جھکائے لکھنے میں مصروف رہا۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔

رحمت دین چائے کی ٹرے لے آیا اور میز پر رکھ کر چلا گیا۔

ندیم نے سر اٹھا کر مینا کو دیکھا "آپ کھڑی ہیں ابھی تک........"

وہ جانے کے بجائے بیٹھ گئی۔ اور چائے کی ٹرے سامنے کرتے ہوئے چائے بنانے لگی۔

"مجھے آپ کے محتاط رہنے کی عادت بہت پسند ہے مس ثمینہ۔" ندیم نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا......... لیکن......... خیر......... شاید آپ اپنی جگہ ٹھیک ہی ہوں........."

"مینا مبہم سے الفاظ سے کچھ نہیں سمجھی۔ چائے بنائی اور پیالی ندیم کی طرف بڑھائی

"ندیم نے پیالی پکڑی۔ جانے مینا کا ہاتھ کانپا یا ندیم کا لرزا۔ پیالی پرچ کے ساتھ دھیرے دھیرے بجی اور تھوڑی سی چائے پلیٹ میں گر گئی۔ مینا اور ندیم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ دونوں کے لبوں پر پھیل گئی.........

مینا کا دل جیسے کسی نغمے کی لے پر دھک دھک کرنے لگا۔

"اچھی چائے بناتی ہیں آپ۔" ندیم نے گھونٹ لیتے ہوئے کہا

"میں؟......... میں نے تھوڑی بنائی ہے........." وہ بولی۔

"مجھے تو بنا کر آپ نے ہی دی ہے......... بہت اچھی ہے۔"

مینا جھینپ گئی۔ اور آہستہ آہستہ چائے سپ کرنے لگی۔ ندیم گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

چائے کے دوران ندیم ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ بے جھجک ہو کر بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ زیادہ تر وہ اپنے بزنس اور اس کے غیر ممالک میں پھیلانے کے متعلق کہہ رہا تھا۔ مینا کو اس کے لمبے چوڑے بزنس کی بہت سی نئی باتیں پتہ لگی تھیں۔

"چائے ختم کر کے وہ اٹھی بہت بہت شکریہ سر۔"

"بہت احسان کیا ہے میں نے۔" ندیم نے پوچھا تو وہ گڑ بڑا گئی۔ اس کے منہ سے نکل گیا "ہاں........"

"ندیم مسکرانے لگا......... "تو پھر ٹھیک ہے احسان کا بدلہ کل چکا دیجئے گا۔"

وہ سرخ ہو گئی۔

اچھا جائیے......... معاف کیا........."ندیم بولا۔

وہ چند لمحے چپ کھڑی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"سر"

"ہوں"

"آپ۔"

"کہئے" ندیم اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے جواب کا منتظر تھا۔

"آپ بریک میں اپنے ریٹائرنگ روم میں ریسٹ کرتے تھے۔"

"ہاں......... چائے بھی وہیں پیتا تھا۔ دوست احباب بھی ادھر ہی بیٹھتے تھے........."

"میری وجہ سے........."

"سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔"

"جی۔"

"پھر؟"

"آپ میرے لئے کہیں اور جگہ بنا دیں نہ...... ریٹائرنگ روم آپ کے لئے۔

"اوہو......" ندیم پن کے سرے سے کھیلتے ہوئے مسکرایا

"بھئی تکلیف تو مجھے واقعی ہے...... لیکن...... آپ کے لئے اور جگہ کہاں بنے؟"

"ہال ہی میں چلی جاؤں۔"

"نہیں......" ندیم ایک دم تحکمانہ لہجے میں بولا...... وہ تحکمانہ لہجے سے ڈر گئی۔ ندیم اسے گہری گہری نظروں سے تکنے لگا۔

دوسرے لمحے اس کا موڈ پھر خوشگوار تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ریٹائرنگ روم ہے تو کافی بڑا...... آپ کی سیٹ ایک طرف ہے باقی حصہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

وہ چپ رہی

"آپ بہت حساس اور بڑی محتاط لڑکی ہیں...... اس لئے بلا اجازت تو میں ادھر آ نہیں سکتا...... آپ کہیں تو چائے پینے ادھر آ جایا کروں......"

مینا کا دل اچھل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ گالوں پر سرخی لہرا گئی اور آنکھوں میں خوف کے سائے مچل گئے۔

"کوئی بات نہیں مس ثمینہ...... بریک کا وقت ہم دو مخلص دوستوں کی طرح بھی گزار سکتے ہیں......"

وہ چپ رہی

"کیوں......؟ اعتراض ہو تو بتا دیں......"

"اس نے نفی میں سر ہلا دیا...... اور اپنے کمرے کی طرف تیزی سے لپکی...... ندیم کے لبوں پر بڑی جاندار سی مسکراہٹ پھیل گئی......

سادہ سی لیکن انتہائی باوقار لڑکی ندیم کے دل میں آہستہ آہستہ اپنا مقام بنا رہی تھی۔ اسے محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ مینا اس کے دفتر میں کام کرنے والی سٹینو گرافر ہی نہیں۔ کچھ اور بھی ہے

کچھ اور کیا؟

بار بار سوچنے پر بھی اسے اس کا پتہ نہ چلتا۔ لیکن محسوسات کے آلے جانچ رہے تھے۔ احساسات نرم و لطیف ہوتے جا رہے تھے۔ مینا کی قربت سکون دینے لگی تھی۔ اس کے ساتھ باتیں کر کے اسے طمانیت حاصل ہوتی تھی...... اس کے ساتھ چائے پینے سے کچھ گھریلو فضا کا تاثر ملتا تھا۔

جس سے وہ محروم تھا۔ اتنی دولت کے باوجود ابھی تک وہ اپنے گھر میں گونجنے والے سناٹوں کو دور نہ کر سکا تھا۔ ویرانی ہی ویرانی لگتی تھی۔

یہ سناٹے اور ویرانی شادی کر کے ٹوٹ سکتے تھے۔ اس کے دوستوں نے اسے مشورہ بھی دیا تھا...... اور۔ وہ خود بھی اب اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔

"مس ثمینہ سے اس کی دوستی بے تکلفی کی حدود میں آ چکی تھی۔ الٹرا ماڈرن سی لڑکی اپنے ممی ڈیڈی کی چہیتی بیٹی تھی......" ممی ڈیڈی نے بیٹی کی پسند پر ہاں کر دی تھی۔ وہ ندیم کی طرف سے پہل کے منتظر تھے۔

"ندیم بھی اب فیصلے کے آخری مرحلے میں تھا۔

لیکن

جب سے اس نے اپنے دفتر میں اس مس ثمینہ کو دیکھا تھا۔ اس کا فیصلہ متزلزل ہو گیا تھا۔ مینا کی سادگی رکھ رکھاؤ اور احتیاط اس کے دل میں گھر بناتی جا رہی تھی .... وہ اکثر مس ثمینہ کا مینا سے موازنہ کرتا .... ترازو کے دونوں پلڑوں میں ان لڑکیوں کو رکھ کر جانچتا .... تو .... مینا کا پلڑا بھاری ہوتا .... ٹھہری ہوئی سنبھلی ہوئی لڑکی کے مقابلے میں نئے فیشن اور جدید تہذیب کی پروردہ مس ثمینہ تنکے کی طرح نظر آئی۔

پھر مس ثمینہ کے گھر کا ماحول بھی اسے پسند نہ تھا۔ اس کے ممی ڈیڈی ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ندی کے دو کناروں کی طرح الگ تھلگ تھے۔ ممی کی اپنی دنیا تھی۔ ڈیڈی کا اپنا جہاں۔ دونوں نے جیسے الگ الگ دنیا بسانے پر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ایک دوسرے سے باز پرس نہ کرنے کی قسم کھالی تھی .... مزاحم نہ ہوتے تھے۔ بس ایک جہاں میں دو الگ الگ جہاں بسا رکھے تھے۔

یہی حال بچوں کا تھا۔ ثمینہ کے اپنے شب و روز تھے اس کے بھائی گگو کی اپنی دنیا تھی۔ چھوٹی امینہ اپنا جہاں ابھی سے الگ بسانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئی تھی۔

ممی ان سب کی سرپرستی کے برائے نام فرض کو نبھا رہی تھی۔ ندیم سے ملنے جلنے باہر آنے جانے کی اجازت انہوں نے بیٹی کو دے دی تھی شادی کا فریضہ ہی ادا کرنا تھا۔ سو وہ کسی وقت بھی کیا جا سکتا تھا۔

ندیم کو مس ثمینہ کے گھریلو ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔ وہ تو تنہا تھا ہی۔ لیکن مس ثمینہ کے گھر میں اتنے لوگ ہونے کے باوجود تنہائی کا احساس ہوتا تھا اس سے خوف آتا تھا۔ وحشت ہوتی تھی۔

"ثمینہ کے ساتھ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں گھومنا پھرنا شروع شروع میں ندیم کو پسند تھا۔ لیکن اس کی بنیادی ضرورت گھریلو ماحول اور پیار بھری فضا تھی۔ جو اسے ثمینہ کے ہاں نہیں ملتی تھی۔ اس کا ذہنی خلا کبھی پر نہ ہوا تھا۔ اسی لئے ثمینہ سے اس

کی طبیعت الجھنے لگی تھی۔

اور

جب سے مینا دفتر میں آئی تھی۔ اور ندیم نے اس کے طور طریق دیکھے تھے۔ یہ الجھاؤ اور بھی بڑھ گئے تھے۔

"گو وہ ابھی مس ثمینہ کے نقوش ذہن سے مٹا نہیں سکا تھا اور نہ ہی پوری طرح مینا کی شبیہہ ذہن میں ثبت کر پایا تھا۔ بین بین ہی لٹک رہا تھا۔ لیکن اسے یہ احساس ضرور تھا کہ ثمینہ کی جگہ مینا بڑے غیر محسوس طریقے سے لیتی جا رہی ہے۔

وہ ہرجائی نہیں تھا۔

مس ثمینہ کو بھی اس نے پسند کیا تھا۔ چاہا تھا۔ اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لئے اس سے دوستی اور محبت کا ناطہ جوڑا تھا۔ ان سب چیزوں کے پس پردہ یہ حقیقت بھی تھی کہ اس لڑکی پر اس نے نظر انتخاب زیادہ تر اس لئے مرکوز کی تھی کہ اس کا نام ثمینہ تھا۔

اور

اب مینا کو نوکری بھی صرف اس لئے دی تھی کہ اس کا نام بھی ثمینہ تھا لیکن اب مینا صرف اپنے نام ہی کی وجہ سے نہیں۔ اپنی شرافت' وقار سنجیدگی اور پاکیزہ سی خوبصورتی کی وجہ سے بھی اس کے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ اسے بعض اوقات تو یوں لگتا جیسے اس کے آئیڈیل نے مینا کا روپ دھار لیا ہو۔

برسوں پہلے اس آئیڈیل نے اس کے ذہن میں جنم لیا تھا۔

اور

اس کی امی نے یہ آئیڈیل اس کے لئے ڈھونڈ بھی نکالا تھا لیکن اسے بدقسمتی کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے آئیڈیل کو پا کر بھی نہ پا سکا تھا .... حوادث نے یہ آئیڈیل چھین لیا تھا .... اس نے دیکھا بھی نہ تھا۔ چھوا بھی نہ تھا .... کھو گیا تھا .... اور صرف ثمینہ نام کی اہمیت اس کے ذہن میں

چھوڑ گیا تھا۔

تب سے اب تک وہ ثمینہ نام کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ مس ثمینہ سے شناسائی ہوئی تھی اور مینا ثمینہ بن کر کھوئے کو پانے کا احساس بن رہی تھی۔

بڑے ہی غیر محسوس طریق سے وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ بظاہر تکلف اور اجنبیت تھی۔ لیکن بے تکلفی کے سارے مراسم طے تھے۔ اجنبیت نام کی شے حائل نہ تھی۔

چائے آفس کی بجائے اب ریٹائرنگ روم میں آ رہی تھی۔

ایک دو تین دن سے وہ ریٹائرنگ روم میں مینا کے ساتھ چائے پی رہا تھا ...... چائے کے بعد بھی کچھ دیر وہیں صوفے پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا ...... مینا کی قربت کا احساس رگ و پے میں خوشیوں کے گنگناتے نغموں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ وہ مطمئن ہوتا جا رہا تھا۔ سکون کی دولت بنا تلاش کے مل رہی تھی...... وہ کتنا آسودہ نظر تھا ان دنوں ...... لیکن

روز روز چائے پینے سے مینا پریشان ہوتی جا رہی تھی۔ قربتیں اس کے لئے سوہان روح بن رہی تھیں۔ یہ راستہ اس کے لئے نہیں تھا۔ اس راستے پر چلنا ممنوع تھا۔ اس پر قدم رکھنا جرم تھا۔ وہ جانتی تھی

وہ جذبات کے سانچے پر چڑھی تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا۔ جیسے جانکنی کے عالم میں ہو ......

وہ ندیم سے محبت کر نہیں سکتی تھی۔

اسے محبت کرنا نہیں چاہئے تھی۔

لیکن

وہ جانتی تھی کہ اسے روح کی ساری شدتوں اور گہرائیوں سے چاہ رہی ہے۔

کشاکش کا عذاب جان لیوا تھا ...... پھر بھی اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ ندیم کے ساتھ چائے نہیں پیا کرے گی۔ اس سے دور رہنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔

اس وقت رحمت دین چائے کی ٹرے لے آیا۔ ٹرے درمیانی میز پر رکھ کر وہ ندیم کو اطلاع دینے گیا۔

مینا اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔

ندیم شاید کسی کام میں مصروف تھا۔ چند منٹ بعد آیا۔

"اوہ ثمینہ ......" اس نے آتے ہی چائے کی ٹرے کو اور پھر اسے دیکھا۔

جی" وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بولی۔

"ابھی چائے کب کی آئی رکھی ہے۔"

"ہاں سر...... رحمت دین رکھ گیا تھا آپ شاید مصروف تھے"

"میں مصروف تھا۔ تو آپ پی لیتیں ......"

"نہیں سر"

اور اس نہیں سر سے ندیم کے چہرے پر لو پھیل گئی ......" اچھا تو لائیے اکٹھے ہی پیتے ہیں۔"

مینا گھبرا گئی ...... نہیں سر سے اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا۔

"آیئے بھی ......" ندیم صوفے پر تقریباً تقریباً نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"سر آپ پیجئے" وہ بولی

ندیم کا ہاتھ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رک گیا۔ اس نے گردن گھما کر مینا کو دیکھا۔

"آپ نہیں پیئیں گی۔" اس نے پوچھا

"آپ تکلیف نہ ہی کیا کریں سر۔"

"کس بات کی" وہ اٹھ بیٹھا ...... سگریٹ اور لائٹر اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"روز چائے"

"کیوں۔ پسند نہیں کیا۔؟"

"کیا۔؟"

"چائے"

"ہے۔"

"تو پھر؟"

وہ چپ رہی۔ ندیم اس کی طرف حیران حیران نظروں سے تکتا رہا

"آپ پی لیں سر۔" اس نے کئی لمحوں کے توقف کے بعد آہستگی سے کہا۔

"آپ کو میرے ساتھ چائے پینا پسند نہیں ......؟" اس نے غور سے مینا کو دیکھا۔

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

ندیم کے چہرے پر خفگی کے سائے لہرا گئے ...... موڈ بدل گیا۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا ...... چائے کی ٹیبل کو پرے دھکیلا۔

"پہلے کہہ دیا ہوتا ...... میں آفس ہی میں چائے پی لیا کرتا۔"

وہ دروازہ اک جھٹکے سے کھول کر اپنے آفس میں آ گیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی اور ایسا اچانک ہوا۔ کہ مینا بوکھلا گئی...... چند لمحے تو اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا ہوا ہے......

لیکن میز پر رکھی جوں کی توں چائے نے احساس دلایا کہ کیا ہو گیا ہے اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

اور کئی لمحے گم صم بیٹھی رہی۔

تمہیں کیا ہوا ہے ندیم۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"تمہاری مرضی۔"

"بتاؤ گے نہیں۔"

"ثمینہ کام کرنے دو......"

"ندیم......"

"ہاں بھئی. کہو کیا کہنا ہے۔ یہ لو سب کچھ پرے ہٹا دیتا ہوں۔ کہو کیا کہنا ہے۔"

ندیم نے کاغذ قلم پرے پھینک کر ثمینہ کی طرف دیکھا۔ جو اس کے دائیں ہاتھ کرسی کے قریب میز سے ٹیک لگائے اس کی طرف رخ کئے کھڑی تھی۔

"اس نے پرنٹڈ لون کے جدید طرز کے کپڑے پہنے ہوئے تھے دوپٹے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ بال سمیٹ کر سر کے عین اوپر چھوٹا سا جوڑا بنا رکھا تھا۔ موسم اور وقت کی مناسبت سے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ پرفیوم فراخدلی سے سپرے کی ہوئی تھی۔ ٹیلکم پاؤڈر بدن پر چھڑکا ہوا تھا۔ گردن کے ننگے حصوں پر ہلکے ہلکے سفید پاؤڈر کے ذرے پھیلے نظر آ رہے تھے۔ وہ سینے سے بیگ لگائے کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ میں گوگلز تھے جنہیں کبھی کبھی بے دھیانی کے عالم میں گھما لیتی۔

اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ الجھن اور بیزاری کے آثار تھے۔

ندیم کو لینے آئی تھی .... اس کے ڈیڈی کے دوست اور بیٹے جرمنی سے آ رہے تھے۔ انہیں لینے ائرپورٹ جانا تھا۔

وہ بڑے مان سے ندیم کو لینے آئی تھی۔ ساتھ لے جانے کی وجہ بھی بتا دی تھی کہ یہ لوگ رشتے کے لئے آ رہے ہیں۔

یہ بڑی تھرلنگ نیوز تھی۔ وہ ندیم کو ستانے کے لئے کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر بتانے آئی تھی۔

ندیم نے تو جیسے کوئی اثر ہی نہ لیا تھا۔

"ندیم تمھیں برا نہیں لگا۔"

"کس بات کا؟"

"جو بات میں نے تمھیں بتائی ہے۔"

"نہیں۔"

"ندیم۔"

"ثمینہ .... تمھیں یہ موقع کھونا نہیں چاہئے۔"

"اوہ .... ندیم .... پلیز .... مجھے تنگ نہ کرو۔ میں پہلے ہی کافی بور ہو رہی ہوں۔ جانے ان لوگوں نے کتنے دن یہاں ٹھہرنا ہے ...."

"ندیم نے اک نظر ثمینہ کو دیکھا تھا اور پھر کام کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ اور قدرے کھویا کھویا نظر آ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت تین چار دن سے تھی۔ الجھا الجھا رہتا تھا طبیعت کچھ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ اپنے ماتحتوں پر بلا وجہ برس پڑتا تھا .... رحمت دین کی تو شامت ہی آئی ہوئی تھی۔

غصہ اسے مینا پر تھا۔ جس نے اسے کی پرخلوص پیشکش مسترد کی تھی ساتھ چائے پینے میں ہرج ہی کیا تھا گھنٹہ آدھ گھنٹہ کا ساتھ ہی تھا نا چند باتیں ہی ہو جاتی تھیں۔

اس میں برائی تھی نہ ہرج .... پھر بھی مینا نے یہ آفر مسترد کر دی تھی۔

تین چار دن سے وہ ریٹائرنگ روم میں نہیں جا رہا تھا۔ بطور احتجاج مینا کو کام بھی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خود ہی جو کام ضروری سمجھتی کر دیتی۔ ندیم کا اس سے سامنا بھی برائے نام ہی ہو رہا تھا۔

مس ثمینہ اس ساری بیک گراؤنڈ سے بے خبر تھی۔ وہ تو ناز و ادا دکھانے آئی تھی۔ ندیم کو چڑانے آئی تھی۔ اس کی محبت کو آزمانے کا یہی موقعہ تھا۔ وہ امیدوار میلوں کی مسافت طے کر کے اسے پانے کی لگن لئے آ رہے تھے یہ موقع ندیم کے لئے چیلنج تھا۔ اس کے صبر کی آزمائش تھی اس کے جذبات کو پرکھنے کا وقت تھا۔

لیکن

ثمینہ کو بے حد مایوسی ہوئی تھی۔ ندیم نے ان آنے والوں کا ذکر سن کر ان سنا کر دیا تھا۔ اور جب ثمینہ نے بار بار ان کے بارے میں بتا کر اسے اشتعال دلانے کی کوشش کی تھی تو وہ بڑے سکون سے اسے رائے دے رہا تھا کہ اسے یہ موقع کھونا نہیں چاہئے۔

ثمینہ کو اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ اور کمال صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"تمھیں ہوا کیا ہے ندیم؟"

اسے ہوا کیا تھا؟

وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ لیکن آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ثمینہ کے مقابل ابھر آنے والی مینا کی شخصیت میں بری طرح ڈوب چکا ہے مینا سے روٹھ کر احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اس لڑکی کو ٹوٹ کر چاہنے لگا ہے اس چاہت کے سرے اسے اپنی ہستی کے اندر دور تک پھیلے محسوس ہو رہے تھے تناور درخت کی بے شمار چھوٹی بڑی جڑوں کیطرح جو زمین کے اندر ہی اندر پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ اور درخت کے تناور وجود کو تن کر کھڑے رہنے کا سبب بنتی ہیں۔

وہ اپنے جذبات کی اس تبدیلی پر خود ہی جھنجلا رہا تھا۔ اپنے آپ کو مینا سے

الگ کرنے کی شعوری کوششیں کر رہا تھا۔ اس پر غصہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے اپنی معمولی سٹینو گرافر سمجھ کر قابل اعتنا نہ ہونے کا احساس اپنے آپ کو دلانے میں مصروف تھا۔

لیکن

چپکے چپکے ہی دل کے معاملے اتنے تنومند ہو گئے تھے کہ یہ ساری کوششیں مضحکہ خیز لگتی تھیں۔ اس کا منہ چڑاتی تھیں۔ اس کا تمسخر اڑاتی تھیں۔ وہ بے بسی سے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ اسی کشمکش نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔

ندیم نے قلم میز پر ڈالکر کاغذ بھی ایک طرف کر دیئے تھے۔ لیکن جس جھنجلائے ہوئے انداز میں اس نے ایسا کیا تھا ثمینہ کو اچھا نہ لگا تھا۔

وہ قدرے برہم نظر آنے لگی تھی۔

"ایسے ہی بیزار ہو تو میں چلی جاتی ہوں۔" اس نے توہین سی محسوس کی اور شاید ندیم اس کا بیگانہ سا جواب دینے کو تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور مینا کچھ کاغذات لئے اندر آگئی۔

اسے دیکھتے ہی ندیم کا موڈ بدل گیا۔ اس نے ساری توجہ ثمینہ کی طرف مبذول کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "ناراض ہو گئیں ......"

ثمینہ نے بھی مینا پر سرسری سی نگاہ ڈالی اور خفگی سے منہ بناتے ہوئے ندیم سے بولی "بڑے خراب ہو ......"

"ہوں تو واقعی ......" ندیم نے مسکرا کر کہا۔ دزدیدہ نظروں سے وہ مینا کے چہرے کو بھی دیکھ رہا تھا۔

مینا چند لمحے ساکت کھڑی رہی۔ اسے اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ یہ لڑکی مس ثمینہ ہے ...... رقابت کا شدید سا احساس اس کے سینے میں مچلا ...... اذیت کے آثار اس کے چہرے پر لہرا گئے۔

ندیم نے ایک دم ہی رویہ تبدیل کر لیا تھا۔ اکھڑے اور سرد لہجے کی بجائے اب

وہ بڑی گرم جوشی سے ثمینہ سے باتیں کر رہا تھا۔ ثمینہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ ہاں اس گرمجوشی سے محظوظ ہو کر کچھ زیادہ ہی ناز و ادا دکھانے لگی۔ ندیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور قدرے اونچا کرتے ہوئے اسے میز پر بٹھا دیا۔

"سر" مینا نے دونوں کو ایک دوسرے میں محو پا کر آہستگی سے کہا کہ حمید اسے اک ضروری خط ٹائپ کرنے کو دے گیا تھا۔ اور یہ خط ٹائپ کر کے ندیم کو دینا تھا۔

ندیم نے اس کی آواز سن کر بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔ ہاں ثمینہ نے گردن گھما کر مینا کو دیکھا...... اور مینا کے اس ہتک پر تیزی سے پلٹنے سے پہلے ہی بولی۔

"ندیم شاید تمہاری سٹینو کو تم سے کچھ کام ہے......"

"ہوں۔" ندیم نے بڑے استحقار سے کہا ...... اور پھر رعب سے گردن گھما کر مینا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟"

"سر یہ خط" وہ جلدی سے بولی

"آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں فارغ نہیں ہوں۔" وہ رعب اور غصے سے بولا

"سر یہ خط حمید صاحب نے ......" مینا کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

"اور ......" ندیم نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔

"کیا ہو رہا ہے تمہیں ......" ثمینہ نے اس کے کندھے پر جلدی سے ہاتھ رکھ دیا ......" بے چاری کی بات سن تو لو......" لیکن

"بے چاری بات سنانے سے پہلے ہی لوٹ گئی ...... اور دروازہ کھٹاک سے بند کر دیا...... وہ نہیں چاہتی تھی کہ آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسو ندیم کے سامنے ہی بہہ نکلیں۔

اور

اس کے جاتے ہی ندیم سابقہ خول میں سمٹ گیا۔

"تمہیں کیا ہو جاتا ہے ندیم ...... گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔"

"وہ کچھ نہیں بولا۔ سگریٹ سلگایا اور جلدی جلدی چھوٹے چھوٹے کش لینے لگا۔

"تم کچھ اپ سٹ ہو" ثمینہ اسے چند لمحے دیکھنے کے بعد بولی

"ثمینہ پلیز........" وہ کرسی پر ادھر ادھر بے تابی سے گھومتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" وہ حیران تھی۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو........" ندیم جلدی سے بولا

"ثمینہ چند لمحے چپ رہی۔

"پھر بولی "تم مینٹل ہو گئے ہو۔"

"ہوا نہیں تو ہو جاؤں گا۔"

"وجہ........"

"تم ہو........"

"میں؟؟؟"

"ہاں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔"

"تم نہیں جاؤ گی۔"

"نہیں........ جب تک اس بیزاری کی وجہ نہیں بتاؤ گے نہیں جاؤں گی۔"

"تمہیں ایئرپورٹ جانا ہے۔ تمہارے مہمان آ رہے ہیں........"

"جہنم میں جائیں مہمان"

"ثمینہ........"

"ہاں۔"

"مجھ پر رحم کرو۔"

"یہی بات میں تم سے کہہ سکتی ہوں اتنے الجھے ہوئے کیوں ہو........" کیا پرابلم ہے........ مجھ سے کہہ دو۔ شاید تمہاری کچھ ہیلپ کر سکوں........" اس نے

زور سے میز پر مکا مارا۔

"اوہ........" ندیم کو ثمینہ پر بے طرح غصہ آ رہا تھا اس لڑکی کو وہ اب قطعاً برداشت نہیں کر سکتا تھا........ دل ہی تھا نا........" کبھی اس پر فریفتہ تھا۔ لیکن اب سیلانی سے دل نے اک اور مرکز تلاش کر لیا تھا........ یہ نیا مرکز بہت پرانا لگتا تھا نئے سے پرانے اور پرانے سے نئے سرے تک پہنچنے کے لئے راستے میں قیام شاید ضروری ہوتا ہے۔ مس ثمینہ اس قیام کا ایک نشان تھی۔ ندیم اس نشان سے گزر چکا تھا۔ اب تو سرے تک جا پہنچا تھا۔ گھوم کر پلٹ کر نشان کو تکتے رہنا اس کے بس میں نہ تھا۔

ثمینہ بھی اپنی حیثیت کے حدود اربع سے واقف تھی۔ ندیم کا یہ ذلت آمیز رویہ اور سرد مہری کب تک برداشت کرتی۔ اچھل کر ٹیبل سے اتری اور پاؤں پٹختے ہوئے ندیم کو غصیلی کٹیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگے ہو........"

"بابا میں اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتا۔ خدا کے لئے اس وقت تم مجھے تنہا چھوڑ دو........ چلی جاؤ........" ندیم نے ہاتھ باندھ کر کہا "اب تم ہی آؤ گے........" ثمینہ نے دھمکی دی........ اور رکھٹ پٹ کرتی کمرے سے نکل گئی۔ نکلتے وقت اس نے غصے سے کواڑ کو اس طرح پٹخا کہ آواز پر ہال میں کام کرتے لوگ بھی ٹھٹک گئے۔

یہ تیسرا دن تھا کہ بینا دفتر آتی اور بغیر کوئی کام کئے چلی جاتی۔ کام کوئی تھا ہی نہیں۔ ندیم نے اسے آفس میں ایک دفعہ بھی نہیں بلایا تھا۔ اور حمید یا کسی دوسرے آدمی نے بھی کوئی چیز ٹائپ کرنے کے لئے نہ بھجوائی تھی۔

بیکار وقت گزارنا اور وہ بھی اک الگ تھلگ کمرے میں بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ اسے تو یوں لگتا تھا۔ جیسے قیدی کی زندگی گزار رہی ہے۔

لیکن

ایسا کیوں تھا۔ کیا دفتر میں واقع کوئی کام نہیں تھا۔

یا

اسے ہی کام نہیں دیا جا رہا تھا۔

ندیم کا رویہ اس سے اسی دن سے بگڑا ہوا تھا۔ جس دن اس نے چائے پینے سے انکار کیا تھا۔

اس بگڑنے کو شاید وہ اس کے جذبات کو سمجھنے کا آلہ بنا لیتی۔ لیکن وہ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو سکتی تھی۔ مس ثمینہ کو اس نے آفس میں دیکھا تھا اور ندیم جس محبت اور پیار کا مظاہرہ اپنی باتوں اور حرکات سے کر رہا تھا۔ وہ ایسی نہ تھیں کہ اسے درگزر کر کے معاملہ اپنے ڈھب پہ لے آتی اور پھر اس دن وہ اس کے ساتھ کتنی برہمی اور بے رحم سے رعب سے پیش آیا تھا۔ وہ آفس میں بیٹھی روتی رہی تھی ...... واپسی کے وقت ندیم نے اسے غور سے دیکھا بھی تھا۔

اُلجن

کوئی لفظ کہنا تو درکنار اس نے تو ہمدردی کی نگاہ بھی اس پر ڈالنا گوارہ نہ کی تھی۔ پھر وہ اس کے اس طرح بگڑنے کو کیونکر اس کی محبت جان لیتی۔

وہ سوچوں میں ڈوبی رہتی۔ اسے یوں لگتا جیسے کسی بحر بے کنار میں ہچکولے کھاتی کشتی میں سوار ہے۔ یہ کشتی ڈوبنا جس کا مقدر ہے بڑی بے رحمی سے اسے یہاں سے وہاں ہچکولے دیتی پھر رہی ہے اسے دور دور کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ بچنے کی کوشش بھی ڈوبنے پر ہی منتج تھی۔

یہ یقین ہو جانے کے باوجود کے ندیم اور مس ثمینہ ایک دوسرے کے متوالے ہیں اور ان کے تعلقات قربتوں کے توسط سے وہاں جا پہنچے ہیں۔ جہاں سے ٹوٹنے کا امکان نہیں رہتا۔ یک جان دو قالب والی بات تھی۔ پھر بھی اسے دکھ اور رنج تھا۔ وہ اس کی محبت میں ڈوب چکی تھی۔ اسے یہ بھی علم تھا۔ کہ یہ اپنی ذات اور شخصیت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ ندیم کی محبت پا کر بھی اسے پا نہیں سکتی۔ لیکن دل دیوانہ ایسی باتیں مانتا کہاں تھا۔ شکست مقدر تھی۔ تو اسے اس شکست ہی سے پیار محسوس ہونے لگا تھا۔ پیار کی لذت سے وہ منہ موڑنے پر قادر نہیں تھی۔

یہی وجہ تھی کہ ندیم کی طرف سے اس سرد مہری اور بے مروتی کے باوجود وہ دفتر آ رہی تھی۔ ذلت اور سبکی بھی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن انسان اپنے ہی جذبات کا غلام ہے یہ غلامی اسے اکثر اوقات ذلت اور رسوائی کے راستوں پر بھی گامزن کر دیتی ہے۔ لیکن بلا سوچے سمجھے اس غلامی میں بھی اک لذت محسوس کرتے ان راستوں پر بھٹکنے کے لئے چل پڑتا ہے۔

بینا کا بھی یہی حال تھا۔

یہ بات نہ ہوتی

تو

وہ دو دن ہی میں فیصلہ کر لیتی کہ اسے یہاں کام نہیں کرنا چاہئے۔

لیکن

وہ

تیسرا دن بھی یونہی بیکار بیٹھ بیٹھ کر گزار آئی تھی۔

لیکن آج وہ بہت مضطرب و بے چین تھی .... اس نے گھر آکر کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ چائے بھی نہیں پی تھی۔

اپنے بستر میں تکئے میں منہ دے کر پڑی رہی تھی۔

امی بے چاری کیا جانتی تھیں۔ کہ اس کے دل و دماغ پر کیا کیا بار ہیں۔ کونسی الجھنیں ہیں کیا کیا مسائل ہیں۔ ان کے ذہن میں تو ایک ہی بات تھی۔ ایک ہی دکھ تھا۔ ایک ہی اذیت تھی۔ اور وہ ہمیشہ اسی نظریئے سے اسے دیکھا اور اس کے متعلق سوچا کرتی تھیں۔

وہ مینا کو ذرا سا بھی مضطرب و بےکل دیکھتیں تو اس سے کئی گناہ اضطراب محسوس کرتیں۔ بات بات پر آنکھیں بھر آنا تو معمول تھا۔

آج بھی مینا کو یوں دیکھا تو بے چین ہو کر کمرے میں آئیں اور پلنگ کے کنارے بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے مینا ...."

"کچھ نہیں امی ...."

"کام سے تھک جاتی ہو"

"نہیں ...."

"پھر کیا ہوا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں ...."

"چائے نہیں پی........"

"پی لوں گی........"

"لا دوں۔"

"میں خود پی لوں گی امی ...."

"بنی۔"

"جی امی"

"اٹھ کر ذرا بیٹھو۔"

"کیوں۔"

"کچھ باتیں کرو۔ تمہیں اس طرح دیکھ کر........"

"اوہ امی .... بس اور کچھ نہ کہئے گا۔"

"کہہ بھی دوں تو کیا ہو گا .... ہمارے نصیب ...."

"بس بس امی جی ...." رونا نہ شروع کر دیجئے گا۔ میں پہلے ہی خاصی پریشان ہوں۔"

"نوکری سے تنگ آگئی ہو تو چھوڑ دو۔"

"کھائیں گے کہاں سے ماں جی۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"اللہ مالک ہے اسی لئے اس نے یہ وسیلہ بنا دیا۔ ورنہ ...." مینا اٹھ بیٹھی امی کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ جلدی سے بولی۔ "امی جی۔ ذرا مزیدار سی چائے بنا لائیں۔ دونوں مل کر پیئیں گے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ میرے متعلق بالکل نہ سوچا کریں........" امی آنچل سے آنکھوں کے کونے صاف کرتے پلنگ سے اٹھ گئیں۔ مینا انہیں کمرے سے جاتے دیکھتی رہی۔ ان کے جاتے ہی چہرے پر لائی ہوئی ساختہ بشاشت غائب ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔

وہ بستر سے اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی اور امی کی مجبوریوں اور محرومیوں کے متعلق سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے لگے۔

امی کے چائے لانے تک وہ خوب رو لی۔ دل کا غبار قدرے ہلکا ہو گیا۔ اور جب امی نے چائے کی ٹرے درمیانی میز پر رکھ کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے امی کی

خوبصورتی آنکھوں کو بھی قدرے سرخ اور متورم پایا۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ ہنس پڑی۔

"آیئے امی" اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ بھی رو چکیں۔ میں بھی ...." وہ ہنس کر بولی

"اب مل کر چائے پینے کا لطف آئے گا۔"

امی بھی ہنس دیں۔ لیکن یہ ہنسی روہانسی تھی۔

دونوں نے تقریباً خاموشی ہی سے چائے پی۔ امی کو بہلانے کے لئے مینا ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

ماں بیٹی اور بیٹی ماں کا سہارا تھی۔ دکھ مشترک تھا۔ لیکن اب مینا نے جو نیا دکھ اپنا لیا تھا۔ اس سے ماں کو آگاہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے چہرے پر خوشگوار تاثر لے آئی تھی۔ اور ماں کو سکون دینے کے لئے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تھی۔

رات اسے ٹھیک طرح سے نیند نہیں آئی۔ کل دفتر جا کر ندیم سے کام کے متعلق فیصلہ کرنے کا فیصلہ کرتی اور توڑتی رہی۔

اگلے دن دفتر گئی۔ اپنی سیٹ پر آ بیٹھی پہلے دنوں کی طرح آج بھی کام نہیں تھا۔ گھنٹہ بھر اس نے اخبار دیکھا۔ منتظر رہی کہ ندیم بلائے گا یا حمید ہی کوئی کام دینے آ جائے گا لیکن کوئی بھی نہیں آیا۔

اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ آخر اس بات کا مطلب کیا تھا؟

جانے کیسے اس میں جرات پیدا ہوئی اور مطلب پوچھنے کے لئے وہ اپنے کمرے سے ندیم کے آفس میں آ گئی۔

ندیم کرسی میں بیٹھا دائیں بائیں غیر محسوس طریق سے جھولتے ہوئے ٹانگ پر رکھی ٹانگ ہلا رہا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا .... وہ فارغ بیٹھا تھا .... میز پر فائل بند پڑے تھے۔

مینا نے اندر آتے ہی اسے سلام کیا۔

لیکن

سلام کا جواب اک گہری اور پراسرار نگاہ تھی۔ جو اس کے سراپا پر پڑی۔

"سر" وہ کچھ گڑبڑائی تو لیکن سنبھل کر بولی۔

"ندیم نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا........ آگے کو جھکا۔ میز پر کہنی ٹکائی اور مٹھی پر گال ٹکاتے ہوئے اسے بغور تکنے لگا وہ بے حد نروس ہو گئی۔

"سر........" وہ گھبراہٹ کے عالم میں بولی

ندیم نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"سر آج چوتھا دن ہے ...." اس نے جلدی سے کہا "میرے پاس کوئی کام نہیں........"

"ہوں۔" ندیم کے منہ سے پہلی دفعہ آواز نکلی........ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے سامنے رکھی فائیلوں کو برابر کیا اور پھر بولا........"

آپ نے محسوس کیا کہ آپ کو کام نہیں مل رہا۔"

"جی سر۔ میں روز انتظار کرتی تھی کہ آپ بلائیں گے یا حمید صاحب کام دیں گے۔" وہ سادگی سے بولی۔

ندیم نے اس کی طرف دیکھا نگاہوں سے نگاہیں ملیں تو جیسے دلوں کے آرپار ہو گئیں۔ دونوں نے نگاہیں جھکا لیں۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ مینا کے ذہن میں خیال بنتے بگڑتے رہے اور ندیم کے من میں سوچیں سنورتی رہیں۔

"مس ثمینہ۔" وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد آہستگی سے بولا۔

"یس سر" وہ چونک سی ہو گئی۔

"میں آپ سے یہ کہوں گا ...."

"جی۔"

"دفتر میں کام اعتماد اور اپنائیت کے سہارے ہوتا ہے۔"

"وہ کچھ نہیں سمجھی۔ چپ چاپ اس کا منہ تکے گئی۔

"اعتماد ہی نہ رہے۔ تو کام کیسے ہو سکتا ہے۔

"جی........ میں کچھ سمجھی نہیں........"

ندیم نے اک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ خاصی سہمی ہوئی تھی۔ آنکھیں پھیلی پھیلی تھیں جن میں کچھ نہ سمجھ پانے کی تباہ کن کیفیت تھی۔

"میں کوئی ایسی زبان نہیں بول رہا مس ثمینہ........" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ میز کے سرے کو ناخن سے کھرچتے ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھے .... بولا ...."

"جی........؟" وہ اب بھی کچھ نہ سمجھی تھی۔

"مس ثمینہ ...." اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "کام اعتماد اور اپنایت کے سہارے کیا جاتا ہے۔ جب دونوں چیزیں ہی نہ رہیں۔ تو پھر کام نہیں ہو سکتا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا........"

وہ چند لمحے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ ندیم کی ان باتوں سے اس نے کچھ اخذ کیا۔ اس کے نتیجے کے طور پر وہ اپنے پاؤں پر ایک دم پلٹی اور تیز قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اس نے یہی سمجھا کہ اب اسے یہاں کام نہیں ملے گا۔ بیکار بیٹھ کر تنخواہ لینے کی اس کی انا اجازت نہ دے سکتی تھی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا .... کنپٹیاں جلنے لگیں ہر چند کہ اسے ملازمت کی اشد ضرورت تھی۔ پھر بھی اس نے جلدی جلدی کاغذ قلم ڈھونڈا استعفا لکھ دیا۔

وہ کاغذ تہہ کر رہی تھی کہ رحمت دین اندر آگیا۔

"رحمت دین" اس نے جلدی سے پکارا

"جی"

"یہ کاغذ بڑے صاحب کو دے آؤ........"

رحمت دین نے پہلے کاغذ اور پھر مینا کو دیکھا۔ تمتماتا ہوا چہرہ پریشان نظریں۔ اضطرابی حرکتیں .... وہ رہ نہ سکا۔ کاغذ پکڑتے ہوئے بول ہی اٹھا۔

"کیا بات ہے بی بی۔"

"کچھ نہیں۔ یہ کاغذ صاحب کو دے آؤ ...."

"اچھا جی۔"

وہ دروازہ کھول کر آفس میں آگیا۔ اور مینا میز پرے دھکیل کر سارے کاغذات اکٹھے کر کے رکھنے لگی۔ یہی چند کاغذات اور ٹائپ رائٹر ہی تو تھا۔ اس کے پاس جو اس نے نوکری چھوڑنے پر دفتر والوں کے حوالے کرنا تھا۔

"صاحب جی۔"

"ہوں۔"

"یہ کاغذ"

"کیا ہے رحمت دین۔"

"صاحب جی۔ یہ کاغذ ثمینہ بی بی نے دیا ہے۔"

"کیا چیز ہے۔؟

"پتہ نہیں ابھی میں ادھر اندر گیا تو انہوں نے یہ کاغذ تہہ کر کے دیا۔"

"لاؤ۔"

"یہ لیجیے......"

رحمت دین کاغذ کو دے کر کمرے سے نکل گیا۔

ندیم نے کاغذ کھولا ...... اس کی نظریں تیزی سے تحریر پر پڑنے لگیں۔

وہ چند لمحے جیسے سکتے میں آیا رہا کاغذ ہاتھ میں پکڑے پکڑے وہ سامنے دیوار پر لگی بڑی سی تصویر کو خالی نظروں سے تکتا رہا۔

پھر

ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

دھکے سے دروازہ کھولا

دوسرے لمحے وہ مینا کے سامنے کھڑا تھا۔

"یہ آپ نے بھیجا ہے......" اس نے کاغذ لہرایا

"جی......" مینا میز پر جھک کر بولی۔

"کیوں۔"

"سر...... میں یہی کر سکتی ہوں۔ مجھے بے کار بیٹھ کر تنخواہ لینا گوارہ نہیں۔"

"کام بھی تو کر سکتی ہیں......"

"لیکن ...... آپ نے ...... خود ہی تو کہا تھا......"

"ہاں میں نے کہا تھا کہ خلوص اور اپنایت کے سہارے ہی کام ہو سکتا ہے۔"

"سر......"

"تو گویا آپ خلوص اور اپنایت کے سہارے کام نہیں کر سکتیں۔"

"میں نے ...... یہ کب کہا ہے سر۔"

"اس تحریر کا مطلب یہ نہیں تو اور کیا ہے۔"

مینا نادم سی ہو گئی ...... اس نے سر جھکا لیا۔ اور انگلیوں کو مسلنے لگی۔

"بولیے نا ......" ندیم نے کہا۔

"سر......" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ ندیم نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ پرزے پرزے کر دیا۔

مینا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کام چھوڑ دینا اتنا آسان کام نہیں مس ثمینہ ......" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

وہ چپ چاپ اسے تکے گئی۔

ندیم نے کاغذ کے پرزے مٹھی میں مسلے اور مینا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "کام آپ کریں گی ...... لیکن خلوص اور اپنایت کے ساتھ ......"

"مینا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک؟" ندیم اس کی اثبات حرکت سے مسرور نظر آ رہا تھا۔

"جی......." وہ بولی

"تو پھر چائے آ جائے .... یہاں .... اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا

مینا سراپا کانپ گئی۔

تو ....

کیا ....

ندیم محض اس وجہ سے بگڑا ہوا تھا۔

اور

اب

ساتھ چائے پینے کی وجہ سے اتنا مسرور تھا؟؟؟

کئی سوال اس کے ذہن میں گڈ مڈ ہو گئے .... ندیم کمرے سے نکل گیا....... اور وہ سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں کے لئے وہ اپنے آپ کو بہت اہم سمجھنے لگی اتنی اہم کہ جس کے بغیر ندیم چائے نہیں پی سکتا تھا .... نہیں پینا چاہتا تھا۔

لیکن

یہ اہمیت مس ثمینہ کے وجود کا احساس ہوتے ہی ختم ہو گئی ندیم اور مس ثمینہ زندگی کی مسافتیں طے کرنے کے لئے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام چکے تھے....... اس کے ساتھ چائے پینے کا اصرار محض وقت گذاری تھا۔ دفتر کی روکھی پھیکی اور تھکا دینے والی مصروفیت سے چھٹکارا پانے کے لئے چند لمحوں کی آسودگی حاصل کرنے کے سوا ندیم کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

نڈھال ہو کر مینا نے سر ہاتھوں سے اٹھایا اور کرسی کی پشت پر ڈال دیا .... اسے کچھ قلبی اذیت محسوس ہو رہی تھی .... دل میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اسے اپنے جذبات کی تندی اور شدت کا پہلی بار پورا احساس ہوا

تھا....... وہ ندیم کو ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی وہ اپنی تمام تر وجاہتوں سے اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا اور یہ سب کچھ کتنی اذیت دے رہا تھا کرب کی کن کن منزلوں سے ہمکنار کر رہا تھا .... یہ وہی جانتی تھی۔

"اف" اس کے لبوں سے نکلا .... تقدیر کی بے رحمی کا گلہ پہلے بھی ہزاروں بار کیا تھا لیکن اب ...."

اس کا جی چاہتا تھا.......تقدیر سے ٹکرا جائے

لیکن جی کے صرف چاہنے ہی سے کیا ہوتا ہے۔ جو بات حد ممکنات سے بھی باہر تھی۔ اس پر جی جلانے سے فائدہ .... یہی سوچ کر وہ سنبھلی

اور

اپنا ذہن اپنا دماغ اور اپنی سوچوں کو کام کی طرف مبذول کرنے کی شعوری کوشش کرنے لگی۔

ندیم اگر مس ثمینہ کی بجائے اس سے پیار و محبت کی پینگیں بڑھا بھی لے تو فائدہ؟

یہ آخری سوچ تھی....... آخری حد تھی .... جس نے مینا کو بے سکون سا کردیا۔ اور وہ ندیم یا حمید صاحب کی طرف سے کام پانے کا انتظار کرنے لگی۔

کوئی نصف گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ مستعد سی نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

لیکن

حمید کام لے کر آیا نہ ندیم نے بلا بھیجا۔

وہ تو رحمت دین تھا۔ جو چائے لے کر اندر آ رہا تھا۔

چائے رکھ کر رحمت دین صاحب کو مطلع کرنے دوسرے دروازے سے نکل گیا۔

"چلو یونہی سہی" مینا نے سوچا....... اور اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم بکھر گیا

.... چند کلیاں نشاط کی چننے والی بات ہی تھی .... اداسی مقدر تو تھی ہی۔ پھر چند لمحے ندیم کی صحبت میں گزار کر خوشی حاصل کرنے میں ہرج ہی کیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور ندیم اندر آتے ہوئے بولا "اجازت ہے۔"

"یس سر........" وہ دھیرے سے بولی

"شکریہ" ندیم کا لہجہ مسرور تھا

وہ اندر آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ درمیانی میز پر چائے پڑی تھی آج کا اخبار بھی تھا۔ ندیم نے اخبار اٹھا لیا۔

مینا اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔

"تشریف لائیے محترمہ مس ثمینہ صاحبہ۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی اور میں ٹھنڈی چائے پینے کا عادی نہیں ہوں۔"

"بہتر سر" وہ کرسی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی دوسرے صوفے پر آ بیٹھی۔

"ندیم سگریٹ سلگا کر اخبار دیکھنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا........ مینا نے دو ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر چائے کی ٹرے اپنی طرف گھسیٹ لی۔

اس نے دو پیالیوں میں چائے بنائی۔

"لیجئے سر۔" ایک پیالی اٹھا کر اس نے ندیم کو متوجہ کیا۔

ندیم نے ہاتھ بڑھایا

اس بار پھر پیالی کانپی اور چائے پلیٹ میں گر گئی۔ شائد دونوں کے خیالات الجھے ہوئے تھے۔

"سوری" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا

اور

پھر

دونوں ہی مسکرا دیئے

"مس ثمینہ" ندیم پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"جی۔"

"چند دن بہت بے مزہ کیا آپ نے........"

"معذرت خواہ ہوں سر۔"

"مس ثمینہ........ اس وقت دفتری اوقات نہیں ہیں۔"

"جی۔"

"بہتر ہوگا آپ مجھے سر نہ کہیں۔"

"نہیں سر۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے........ احترام کا اپنا مقام ہوتا ہے۔"

"آپ کی مرضی۔ ویسے میں اس وقت آپ کو بھی صرف ثمینہ کہہ دوں تو برا نہ منئے گا۔"

مینا چپ ہو گئی۔ لیکن بڑی خوداعتمادی سے وہ اس کے سامنے بیٹھی رہی۔

روز چائے ساتھ پینا معمول بن گیا۔

اس وقفے میں دونوں بہت سی باتیں کرتے۔ لیکن مینا کی سوچ اپنے ہی متعین کردہ راستوں پر چل رہی تھی اس لیے وہ ندیم کی باتوں کو اسی نظریے سے دیکھ رہی تھی۔ ہاں دوستی کا ناطہ اس نے ضرور قائم کر لیا تھا اور اس ناطے سے اب قدرے بے تکلفی سے ندیم سے باتیں کرنے لگی تھی۔

اس دن موسم بڑا سہانا تھا۔ بادل گھیر آئے تھے اور ٹھنڈی ہوائیں نم آلود سی تھیں' ائیرکنڈیشنر بند تھا اور قدرتی ہواؤں کو بلا روک ٹوک آنے کے لیے کھڑکی کھول دی گئی تھی۔

رحمت دین چائے میز پر رکھ گیا تھا۔ آج موسم کی مناسبت سے وہ گرم گرم سموسے بھی ساتھ لایا تھا۔

ندیم اور مینا آمنے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مینا کے بالوں کی کچھ لیٹں آوارگی پر اتر آئی تھیں۔ ہواؤں کی سرسراہٹیں ڈوپٹے کو بار بار بے ترتیب کر کے بالوں کی لٹوں کو گستاخی پر آمادہ کر رہی تھیں۔ ندیم کی نگاہیں مینا کے چہرے کا بار بار

طواف کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر بلا کا تقدس تھا........ حیا کی رنگینی تھی........ بالوں کے بار بار گالوں تک آ جانے پر وہ جب جھنجلا جاتی تو ندیم کو اک لطیف سی گدگداہٹ اپنے سینے میں محسوس ہوتی۔

اور

جب مینا بالوں کو سختی سے پکڑ کر کانوں کے پیچھے کرتی تو بے اختیار ندیم کا جی چاہتا کہہ دے "پڑا رہنے دو........ ان زلفوں کو حسین گالوں پر........ کہ یہ دیوانگی پر اتری ہوئی ہیں........ دیوانوں سے ان کا حق مت چھینو........ نہ ہی انہیں فرزانگی کا سبق دو........ یہ دیوانگی بذات خود بڑی عظیم ہے۔"

اس کی نگاہیں بول رہی تھیں........ اور بولتی نگاہیں اپنا مفہوم بھی سمجھا رہی تھیں۔

مینا خوداعتمادی کے باوجود ڈانواں ڈول ہوئی جا رہی تھی........ وہ بے حد محتاط تھی۔ لیکن اس وقت ہر احتیاط بد احتیاطی پر جیسے منتج ہونے کو تلی ہوئی تھی۔

مینا کی مشکل رحمت دین نے حل کر دی۔ آفس کا دروازہ ذرا سا کھول کر اس نے ندیم سے کہا۔

"جناب آپ کا فون ہے........"

"کون ہے۔" ندیم نے اپنے طلسماتی تصور سے نکلنے پر بیزار ہو کر پوچھا

"مس ثمینہ ہیں صاحب جی........"

"مس ثمینہ........؟"

"جی صاحب۔"

مینا نے ندیم کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا برہم نظر آ رہا تھا۔

"ان سے کہہ دو........ میں فارغ نہیں ہوں........" وہ جلدی سے بولا........

"اچھا صاحب جی۔" رحمت دین دروازے سے ہٹ گیا

ندیم نے نیا سگریٹ سلگایا........ اور تیزی سے کش لینے لگا اس کا موڈ یکسر بدل چکا تھا۔

"اور چائے لیں گے سر۔" مینا نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا

"ہوں........ ہاں........ بنا دیں........" ندیم نے ادھا سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک دیا

مینا چائے بنانے لگی

"لیجئے" اس نے پیالی ندیم کی طرف بڑھا دی۔ لیکن ندیم نے پیالی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ بس چپ چاپ بیٹھا سامنے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھتا رہا۔

"سر چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے اور آپ ٹھنڈی چائے پینے کے عادی نہیں۔" مینا نے ذرا شوخی سے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔

"اوہ........ رہنے دیں۔ ٹھنڈی ہو گئی۔" ندیم نے پیالی اٹھاتے ہی واپس رکھ دی۔

چند لمحے بے کیف سی خاموشی کی نظر ہو گئے۔

"سر" مینا نے بڑی جرات سے کہا۔

"ہوں" وہ بے خیالی کے عالم میں بولا

"سر" اس نے پھر کہا

"ہوں" ویسا ہی جواب ملا

وہ مسکرا دی۔

"سر ایک بات کہوں۔"

"کہئے۔"

"مس ثمینہ کا فون تھا۔ آپ سن ہی لیتے۔"

ندیم نے اک بھرپور نظر مینا پر ڈالی۔ مینا اس نظر سے ہڑبڑا گئی۔"

"میں اس لڑکی سے بور ہو چکا ہوں۔" ندیم نے آہستگی سے کہا۔

مینا نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اک لمحہ کو اسے یوں لگا جیسے مس ثمینہ لڑکی نہیں کھلونا ہے۔ جس سے کھیل کھیل کر ندیم بور ہو چکا ہے۔ ندیم کا کردار اسے بڑا سبک سا لگا

"اس لڑکی کا نام ثمینہ نہ ہوتا۔ تو شائد میں اس سے کبھی مراسم بڑھانے کا سوچتا بھی نہیں......" ندیم نے خود ہی کہا تو مینا چونک کر اسے تکنے لگی

ندیم کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ مینا کو اس سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہوئی۔ اس کے کردار کو جو اس نے اک لمحہ کو سبک سمجھا تھا۔ کسی نفسیاتی گرہ کا اسیر لگنے لگا۔

وہ دھیرے سے بولی "سر...... آپ ثمینہ نام سے بڑے متاثر ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

ندیم نے اک بے چین سی نگاہ اس پر ڈالی اور گمبھیر آواز میں بولا۔

"یہ نام...... یہ نام مجھے اچھا لگتا ہے......"

"نام تو اور بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ آپ کو یہی نام کیوں اچھا لگتا ہے سر۔"

"یہ نام میری بیوی کا تھا......"

"بیوی؟"

بے ساختہ حیرانگی سے مینا کے منہ سے نکلا...... ندیم نے اس کی طرف دیکھا۔ اور دھیمی آواز میں بولا...... "ہاں...... میری بیوی جو مر گئی۔"

مینا صوفے میں پیچھے کو ہٹ گئی۔ اک گہری سانس اس نے لی جانے یہ گہری سانس مرنے والی کے لیے تھی۔ یا اس کے مر جانے کے احساس سے طمانیت ہونے پہ......

ندیم کچھ کہنے کو تھا کہ رحمت دین نے دروازہ کھول کر اندر آنے کی اجازت چاہی،

"اب کیا ہے۔" ندیم نے بیزاری سے پوچھا......

"جناب کراچی سے فون ہے۔"

ندیم اٹھ کھڑا ہوا

اور مینا بھی اپنی سیٹ کی طرف آ گئی۔

"امی"

"جی"

"یہ رہی تنخواہ"

"جیتی رہو"

"لیکن آج دو سو کم ہیں۔"

"کیوں۔"

"میں نے رکھ لیے

"اچھا کیا۔"

"امی پوچھیں تو سہی کس لیے رکھ لیے ہیں۔"

"اب میں کیا پوچھوں......."

"امی میں آج آپ کے لیے اچھے اچھے کپڑے لاؤں گی۔؟

"اوہ مینا بیٹی۔ ان کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہے......."

"ضد نہ کرو۔ میرے پاس ابھی کپڑے ہیں۔"

"بڑے نت نئے پرنٹ آئے ہیں لان میں......."

"تو اپنے لیے...... صرف آپ کے لیے...... بس اس دفعہ تو ضرور ہی لا دوں گی۔"

"جیسے تیری مرضی بیٹی......."

"باقی پیسوں سے مہینہ گزر جائے گا نا......."

"کیوں نہ گزرے گا۔ اتنے پیسوں کی خریداری تو تقریباً ہر ماہ ہو ہی جاتی ہے۔ پچھلی دفعہ تو میں تقریباً اڑھائی سو روپے کی چیزیں لائی تھی۔"

"دو بستروں کی چادریں اور تولیے وغیرہ......."

"ہاں بیٹی۔ یہ چیزیں بھی تو ضروری ہوتی ہیں...... خدا کا شکر ہے تمہیں نوکری مل گئی ورنہ......."

"ہاں امی خدا کا شکر ہی ہے۔ نوکری نہ ملتی۔ تو اب زیور کی باری تھی......."

"بچ ہی گیا...... زیور کا بھی اچھا سہارا ہے۔"

"میں تو کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ اک معجزہ ہی ہے جو زیور ہم ساتھ لے آئے۔"

"بالکل......"

"اف...... جب کبھی میں سوچتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں۔ وہ بھی کیا وقت تھا......."

"اللہ معافی دے۔"

دونوں ماں بیٹی گزرے وقت کی المناکی اور خوفناکی کو یاد کرنے لگیں شام مینا نے بازار جانے کا پروگرام بنایا۔ پچھلے جمعہ وہ اپنی نئی نئی دوست راحیلہ کے ہاں گئی تھی۔ وہ بازار سے لان خرید کر لائی تھی بہت سے پرنٹ تھے جن میں دو تین مینا کو بہت پسند آئے تھے اور اس نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ تنخواہ ملنے پر وہ امی کے لیے ضرور یہ پرنٹ خریدے گی۔

"امی آپ ساتھ چلیں گی۔" مینا نے تیار ہو کر ماں سے پوچھا۔

"آپ نے احسان کی امی سے ملنے جانا تھا۔"

"ہاں۔"

"تو آئیں۔ رکشا تو لینا ہی ہے۔ آپ کو وہاں اتار دوں گی۔"

"یہ بات ٹھیک ہے......... وہ دو تین بار آ چکی ہیں۔"

"آپ بھی چلی جایا کریں......... کسی نہ کسی کے ہاں......... کچھ اچھا وقت ہی گزر جاتا ہے۔"

"دو منٹ ٹھہر۔ میں کپڑے بدل لوں۔"

"آپ اطمینان سے تیار ہو جائیں۔ میں یہاں بیٹھتی ہوں۔"

"ساحرہ آئی ہوئی ہے اس سے مل لو۔ پوچھ رہی تھی تمہارا۔"

"اچھا امی۔"

"وہ برآمدے سے اتری اور گھوم کر دوسری طرف چلی گئی۔ ساحرہ آئی ہوئی تھی۔ ماں بیٹی پچھلے صحن میں بیٹھیں تھیں۔

ساحرہ مینا سے بڑے تپاک سے ملی......... وہ اس سے عمر میں چھوٹی تھی۔ اسے باجی مینا کہا کرتی تھی۔ چھ سات سال دونوں نے اسی گھر میں اکٹھے گزارے تھے۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی۔

"بیٹھو نا......... مینا بیٹی........." ساحرہ کی امی نے کہا۔ "دفتر نے تو تمہیں ہم سے چھین ہی لیا ہے........."

"بس خالہ جان......... مجبوری ہی ہے نا........."

"خدا تمہاری سختی معاف کرے........."

مینا ہنس پڑی

کتنے دن رہو گی یہاں۔" مینا نے ساحرہ سے پوچھا

"چار دن"

"بس۔"

"ہاں......... صرف اتنی ہی چھٹی ملی........."

"امین بھائی بھی آئے ہیں۔"

"کل آئیں گے۔"

"صرف ایک دن کے لیے۔"

"ہاں۔ وہ بھی اس لیے کہ یہاں میوزیکل کنسرٹ ہے۔ وہ دیکھنے۔"

ساحرہ نے مسکرا کر کہا۔ پھر بولی "چلو گی تم بھی"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایسی عیاشی ہم نہیں کر سکتے ساحرہ بی بی۔"

"کہاں جا رہی ہیں۔" ساحرہ نے اس کے ہاتھ میں بٹوہ دیکھ کر پوچھا۔

"بازار چلنا ہے"

"نہیں باجی......... خواہ مخواہ پیسے خرچ ہو جاتے ہیں۔"

"شادی کر کے سیانی ہو گئی ہے۔" اس کی امی نے کہا

"ہاں خالہ......... پہلے تو کیسے پیسے اڑایا کرتی تھی"

سب مسکرانے لگیں۔

"مینا بیٹی۔" امی نے اپنے برآمدے سے آواز دی

"آئی۔" مینا نے جلدی سے کہا۔

"پھر بھی آنا مینا باجی۔" ساحرہ نے کہا

رات تم آنا آرام سے باتیں کریں گے۔"

"اچھا۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

مینا تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے برآمدے کی طرف آ گئی۔

امی کو بیگم احسان کے گھر کے سامنے اتار کر مینا نے رکشے والے کو مارکیٹ چلنے کہا.........

چند لمحوں بعد وہ ورائٹی سٹور کے سامنے تھے.........

رکشے والے کو پیسے دے کر وہ فٹ پاتھ پر آئی اور پھر آہستہ آہستہ چلتے ورائٹی ر کے گیٹ نما شیشے کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ وہ سیدھی سوتی کپڑے کے

کاؤنٹر کی طرف گئی۔ جہاں اور بھی عورتیں اور مرد کھڑے کپڑا دیکھ رہے تھے۔

یہ ڈیپارٹمنٹل سٹور تھا۔ کئی حصے تھے۔ جن میں الگ الگ چیزیں شوکیسوں الماریوں میں سجی تھیں۔ یہ سٹور عام دکانوں سے نسبتاً مہنگا تھا۔ لیکن ورائٹی ا تھی کپڑے کے جو پرنٹس یہاں ملتے تھے کسی اور دکان پر مشکل ہی سے نظر آتے یہ پورا سٹور ایئرکنڈیشنڈ تھا۔ خرید و فروخت کا طریق بھی مغربی طرز کے سٹوروں طرف تھا یہاں امیر کبیر لوگ آتے تھے فیشن کے دلدادہ بھی یہیں نظر آتے تھے۔

مینا نے لان کے نئے نئے پرنٹ دیکھے۔ راحیلہ کے کپڑوں سے بھی زیا خوبصورت چیزیں نظر آئیں۔

اس نے سوبر قسم کے دو سوٹ امی کے لیے خریدے اور ایک بڑی جاندار ا شوخ پرنٹ کا جوڑا اپنے لیے اتروا لیا۔

اس نے خریدنا صرف یہی تھا۔ بٹوے میں مل ملا کر کل تین سو روپے تھے۔ بھی وہ اپنے پیکٹ اٹھا کر دوسرے حصے کی طرف چلدی۔ اچھی اچھی خوبصورت نایاب نایاب چیزیں خرید تو نہ سکتی تھی۔ دیکھنے میں کیا حرج تھا۔

پھر

یہ چیزیں دیکھ کر اسے اپنے گھر کی چیزیں بھی تو یاد آ جاتی تھیں اس کے ابو ایسے ایسے نوادرات خریدنے کا شدید جنون تھا۔ گھر کو کس خوبصورتی اور سلیقے سے رکھا تھا انہوں نے۔

ایرانی غالیچے...... ریشمی پردے...... بھاری بھاری فرنیچر...... ڈیکوریشن پیس...... کلوکلاک...... اور نایاب پینٹنگز......

لیکن

یہ سب عہد رفتہ کی باتیں تھیں۔ جنہیں ذہنی دریچوں سے جھانک کر تو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن حال میں لوٹایا نہیں جا سکتا تھا۔

وہ اس حصے میں آ گئی۔ جس میں قیمتی گھڑیاں۔ کلاک اور کچن کی گھڑیاں

نیں۔ قیمتی واز بھی یہیں تھے اور چینی کی ڈیکوریشن کی گڑیاں بھی رکھی تھیں۔ لوگ انی تعداد میں یہاں بھی گھوم پھر رہے تھے وہ اس شوکیس کے سامنے ٹھٹک کر کھڑی ہو ئی۔ جس میں ایک ڈینش لڑکی کا چینی کا سراپا تھا۔ یہ ڈیکوریشن پیس اس کے کمرے ں بھی رکھا ہوتا تھا۔ اس کے ابو نے باہر سے منگوا کر دیا تھا۔ بے اختیار اس جی چاہا۔ کہ وہ اس گڑیا کو اٹھا لے۔

لیکن

قیمت کا ٹیگ پڑھ کر اس کا دل ہول گیا۔ لیکن وہ والہانہ وارفتگی سے اسے تکے ئی۔

"مس ثمینہ"

کسی نے اسے پکارا اور بے سدھ سی کھڑی مینا اپنے آپ میں آ گئی

"اوہ...... آپ سر......" وہ اپنی پشت پر کھڑے ندیم کی طرف مڑتے ئے بولی

"بڑے انہماک سے چیزیں دیکھ رہی تھیں......" وہ اسے بھرپور نظروں سے یہ کر بولا

"جی...... جی یہ گڑیا......" وہ صرف اسی قدر کہہ سکی۔

"بہت اچھی ہے۔" ندیم نے شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

اس نے بے اختیارانہ سر اثبات میں ہلا دیا

ندیم ہنس دیا

"خرید لیں...... اچھی چیز ہے۔" اس نے کہا "ویسے ابھی آپ نے گڑیاں ہی لنی ہیں کیا؟"

"سر یہ ڈیکوریشن پیس ہے۔" وہ جلدی سے بولی

"ہاں۔ لیکن ہے تو گڑیا۔"

"جی!"

"خریدنا ہے؟"

"نہیں........"

"دیکھ تو بڑے شوق سے رہی تھیں۔ اتنے شوق و انہماک سے کہ گردوپیش کا ہوش ہی نہیں تھا۔"

"جی........؟"

"میں کئی منٹ سے کھڑا آپ کو دیکھ رہا تھا۔"

"اوہ........ سر........ واقعی........؟"

"ہاں" وہ پھر مسکرا دیا

مینا نے اک گہری سانس لی اور پھر آہستگی سے بولی "بات دراصل یہ ہے کہ بالکل یہی گڑیا میرے پاس بھی تھی........"

"ٹوٹ گئی........؟"

وہ چند لمحے چپ رہی پھر آہستگی سے بولی "ہاں"

"تو لے لیں نا........"

"نہیں سر۔"

"کیوں؟ اتنی پسند ہے آپ کو........"

وہ خفت سے مسکرا کر بولی۔ "ضروری نہیں کہ پسند کی ہر چیز حاصل کر لی جائے۔"

ندیم اس کے جملے سے جانے کیا سمجھا۔ بڑے غور سے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔

وہ ان نظروں سے سٹپٹا گئی۔ باہر جانے کو قدم اٹھاتے ہوئے بولی

"آپ یقیناً شاپنگ کے لیے آئے ہیں........ میں تو خرید چکی........"

وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا

"سر آپ اپنا کام کر لیں۔" وہ چند قدم جانے کے بعد بولی

"تو آپ اب واپس جا رہی ہیں۔"

"جی..... کچھ کپڑا لینا تھا لے لیا........"

"تھوڑی دیر میرے لیے رک سکتی ہیں؟؟"

"سر!"

"میں نے دو ایک چیزیں خریدنا ہیں........ آیئے........"

وہ چند لمحے ہچکچائی

"آیئے نا........" وہ بڑے اصرار سے بولا........ "اکیلے اکیلے شاپنگ کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا........"

"سر آج آپ اکیلے کیوں آئے ہیں۔" بے اختیار ہو کر اس کے منہ سے نکل گیا۔

ندیم نے گردن موڑ کر اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا

"کس کے ساتھ آتا........؟"

"مس ثمینہ کے ساتھ........" وہ قدرے شوخی سے بولی

ندیم نے پھر اسے گہری گہری نظروں سے دیکھا اور پھر یہ نظریں شریر سی ہو گئیں۔ دھیمی سی جگمگاتی مسکراہٹ لبوں پر لیے ہوئے وہ اسے تکتے ہوئے بولا۔ "تو اکیلا ہی تھا۔ لیکن اب ثمینہ کے ساتھ ہوں۔"

اس نے جیسے لفظوں کے پھیر میں بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی مینا کو وہ شوخی بھول گئی۔ دل بے اختیار ہو کر دھک دھک کرنے لگا۔

"آیئے........" ندیم نے اس کی خوبصورت آنکھوں پر جھک کر لرزنے والی پلکوں کو والہانہ پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر آپ خود ہی شاپنگ کر لیں .... مجھے دیر ہو رہی ہے" وہ گھبرا کر بولی۔

"میرا ساتھ دینا گوارا نہیں ...." ندیم نے سنجیدگی سے ذو معنی بات کی

" سر........میں کسی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔" اس کے منہ سے نکلا اور

آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ تیز قدم اٹھاتے وہ سٹور کے اس حصے کی طرف بڑھی۔ جہاں بل کی پے منٹ کرنا تھی اس نے مڑ کر نہیں دیکھا کہ اس کی بات کا ندیم نے کیا اثر لیا ہے۔

بہت سے لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے کھڑے تھے وہ بھی ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ندیم کی باتوں اور اس کے انداز نے کیا کچھ کہہ دیا تھا؟" وہ سوچ سوچ کر جیسے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن ان سوچوں کے الجھے دھاگوں میں کوئی سرا ایسا نہ تھا جسے وہ مسرت و خوشی کا سرا سمجھ کر پکڑ لیتی۔ اس کی حالت پانی میں کھڑے اس پیالے کی سی تھی جسے پانی پینا تو درکنار پانی ہونٹوں تک لے جانے کی بھی ممانعت تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ندیم بھی وہیں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی گڑیا تھی۔ ندیم نے مینا پر اک نگاہ ڈالی یہ نگاہ سفاکانہ حد تک بیگانہ تھی مینا نے اپنا بل ادا کیا اور باہر آ گئی۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑی رکشے کا انتظار کر رہی تھی کہ ندیم بھی اندر سے آگیا۔ اپنی چیزیں اٹھائے وہ اس کے قریب سے گزر گیا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ مینا دیکھتی رہی۔ ندیم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں ......مینا دھندلائی نظروں سے اسے تکتی رہ گئی۔ اور وہ گاڑی نکال کر لے گیا۔

وہ اس سے ایک بار پھر روٹھ گیا تھا ...... وہ جان گئی تھی جان جانا جان پر بن آنے کے مترادف تھا۔

لیکن

لیکن

وہ کیا کرے؟

کیا......

کرے؟؟؟

"مینا باجی"

"ہوں"

"آج رات ساڑھے سات تیار رہیے گا۔

"کیوں"

"جانا ہے"

"کہاں"

"تفریح کیلئے"

"ساحرہ......میں کہیں نہ جا سکوں گی۔"

"کیوں جی ......"

"بس"۔

"مینا باجی میں نے خالہ جان سے اجازت لے لی ہے اور اطلاع کیلئے عرض ہے کہ ٹکٹ بھی لے لئے ہیں......"

"ٹکٹ؟"

"ہاں۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"میوزیکل کنسرٹ ہو رہا ہے جناب اور آپ کو خبر ہی نہیں میں امین۔ باجی اظہر بھائی ......فوزیہ اور آپ ...... آج شام ساڑھے سات بجے جا رہے ہیں......"

"لیکن"

"لیکن ویکن کچھ نہیں .... آپ کو جانا پڑے گا اور ضرور جانا پڑے گا۔ ویسے بھی دو تین دن سے آپ بہت پریشان پریشان لگتی ہیں۔ تفریح آپ کیلئے بے حد ضروری ہے........"

"ضروری تو خدا جانے کیا کچھ ہے"

"لیکن جو کچھ مل سکتا ہو۔ اسے تو کھونا حماقت ہے نا۔ دو چار گھنٹے کی تفریح ہو جائے گی تو آپ کا ذہن صاف ہو جائے گا اور طبیعت بشاش ہو جائے گی۔"

"اوہ.........ہو........"

"اوہ ہوں ....مینا باجی .... آپ ضرور جائیں گی۔ اب تو ٹکٹ کے پیسے بھی خرچ دیئے ہیں میں نے ...."

"مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا........"

"ضرورت نہیں سمجھی.......کچھ تو مان ہے آپ پر ...."

مینا ساحرہ کی اس بات سے لاجواب ہو گئی

"اچھا بھئی۔ تم مجبور کرتی ہو تو چلیں گے۔"

"شوق تو ہے نا گانا سننے کا؟؟"

"ہاں بہت ہے"

"تو پھر بن کیوں رہیں تھیں......."

"بننا کیسا ساحرہ۔ بس جی چاہتا ہی نہیں ....کچھ ...."

"دوسروں کو عقلمندی کا درس دینے والی مینا باجی۔ آپ کبھی کبھی یہ درس خود لینا کیوں بھول جاتی ہیں ....بھول جایا کریں سب کچھ اور جتنے لمحے خوشی کے میسر آسکیں انہیں چن کر جھولی میں ڈالنے میں ہچکچایا نہ کریں ...."

"ہونہہ........" مینا کی آنکھوں میں سوچ تھی۔ ساحرہ کو کیسے بتا دیتی کہ ایسا کہنا آسان ہے کرنا مشکل خوشی کے لمحے تو وہ ندیم کی صحبت سے بھی چن سکتی تھی۔

لیکن!!

وہ ایسا کر بھی سکتی تھی؟

جواب نفی میں تھا

"ساحرہ" مینا نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا "تم نے جو نصیحت کی ہے۔ اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی ....اور پہلی کوشش یہی ہے کہ تمہارے ساتھ آج رات چلی جاؤں گی۔"

"زندہ باد .... مینا باجی ....زندہ باد......... ساحرہ خوش ہو گئی۔

"رات کپڑے کون سے پہنیں گی"

"کپڑوں پر کوئی پابندی ہے۔"

"نہیں تو........"

"پھر وہی پہن لوں گی جو میرے پاس ہیں۔"

"ساڑھی پہنئے گا........"

"کیا ضروری ہے؟"

"ہاں۔ آپ ساڑھی میں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

مینا مسکرا دی

ساحرہ اسے اس کنسرٹ میں شرکت کرنے والے گلوکاروں کے نام بتانے لگی۔ گلوکار چوٹی کے تھے اور مرد گلوکار تو مینا کا پسندیدہ گلوکار تھا۔ رات وقت پر تیار ہو کر وہ ساحرہ کے ہاں آگئی۔ سبھی لوگ تیار تھے۔ اظہر اور فوزیہ بھی آگئے تھے۔

وہ شادی شدہ جوڑوں کے ساتھ اکیلے جاتے ہوئے مینا کو عجیب سا لگا۔ لیکن اب وہ تیار ہو کر آچکی تھی۔ جانا ہی تھا

فائیو سٹار ہوٹل کے ایک خوبصورت لان میں اہتمام کیا گیا تھا۔ سٹیج کے گرد نیم ہالے کی صورت میں کرسیاں بچھی تھیں۔ لائٹیں جگمگا رہی تھیں اندھیروں کو نگل کر چار سو روشنیاں بکھر رہی تھیں۔

کافی لوگ آچکے تھے ان سب کو بمشکل اگلی نشستوں پر جگہ ملی وہ بھی اظہر نے یہاں اپنے ایک دوست کو کہہ رکھا تھا جو جگہ مل گئی سامنے کی پوری دو قطاریاں معزز مہمانوں کیلئے مخصوص تھیں یہاں صوفے اور گدے دار کرسیاں بچھی تھیں۔

لوگ آرہے تھے اور اپنی اپنی سیٹیں سنبھال رہے تھے۔ عورتیں مرد لڑکے لڑکیاں بڑے ذوق و شوق سے میوزیکل کنسرٹ میں شریک ہونے آرہے تھے

موسم آج سہانا تھا۔ سہ پہر خاصی زور دار بارش ہوئی تھی اور اب ہوا نرم روی سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی۔ بارش کی نمی ہواؤں میں جذب تھی۔ جب بھی کوئی شریر سا جھونکا آتا ہلکی سی کپکپاہٹ بدن میں ضرور پیدا کر دیتا چمن میں لگے پھولوں کی مہک بھی نم آلود ہواؤں میں رچی تھی یہ سب کچھ بے حد خوشگوار لگ رہا تھا۔

اظہر کے ساتھ فوزیہ بیٹھی اور ساحرہ کے دوسری طرف امین فوزیہ اور ساحرہ کے درمیان مینا نے جگہ لی۔

فنکشن کوئی آدھ گھنٹہ لیٹ شروع ہوا ۔ سٹیج سکریٹری نے مائک سنبھالا اور چھوٹی سی تعارفی تقریر کے ساتھ معزز مہمانوں اور کنسرٹ کا اہتمام کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ تعاون کرنے والوں کے نام پر مینا چونکی سپونسر ندیم اینڈ کو نے کیا تھا۔

تو

یقیناً ندیم بھی یہاں آیا ہوگا۔

اس نے اچٹتی سے نگاہ اگلی قطار میں بیٹھے لوگوں پر ڈالی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

فوزیہ اور ساحرہ باتوں میں مشغول تھیں۔ فنکشن میں شریک ہونے والی جانی پہچانی صورتوں کو دیکھ کر ایک دوسری کو ستا رہی تھیں۔ انجانی عورتوں کے فیشن کپڑوں اور میک اپ پر بڑی روانی سے تبصرے کر رہی تھیں۔ ان کی باتوں میں اظہر اور امین بھی کبھی کبھی شریک ہونے کو جملہ کہہ دیتے۔ مینا خاموش ہی تھی ....اس کے ذہن میں ہلچل سی تھی

وہ ندیم کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ندیم جو دو تین دنوں سے اس سے روٹھا تھا مگر اس دفعہ اس نے کام دینا بند نہیں کیا تھا۔ نہ ہی بات چیت کرنا ترک کی تھی لیکن وہ بے تکلفی اور اپنائیت نہ رہی تھی جو چائے کے دوران ہوتی تھی وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔ یوں جیسے کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہی ہو۔ دفتری کاموں کے علاوہ اس نے ان دنوں مینا سے کوئی بات نہ کی تھی گانا بجانا شروع تھا۔ پہلے چھوٹے فن کار آئے اور اپنی اپنی پسند کے نغمے سنا کر لوگوں سے تھوڑی بہت داد لے کر سٹیج سے اتر گئے اب مشہور اور نامور گلوکار کی باری تھی اس کا نام سنتے ہی لوگوں نے بڑے جوش و خروش سے تالیاں بجائیں اور جب تک وہ مائیک کے سامنے آکر کھڑا نہیں ہو گیا تالیوں کی گونج سنائی دیتی رہی

یہ گلوکار مینا کا بھی پسندیدہ گلوکار تھا۔ وہ بھی خوشی کے اظہار کے طور پر تالیاں بجا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے ساحرہ اور فوزیہ کو بتا بھی رہی تھی کہ وہ گلوکار اپنی جادو بھری آواز کی وجہ سے اسے کتنا اچھا لگتا ہے وہ اس وقت سوچوں کے خول سے باہر نکل آئی تھی۔

اور

اسی وقت وہ خوبصورت آنکھیں اسے گھورنے کے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔

جن سے وہ بالکل بے خبر تھی

گلوکار نے بڑی خوبصورت اور مرصع غزل سنائی۔ سننے والے بڑی خاموشی اور انہماک سے سن رہے تھے کبھی کبھی کسی مرصع شعر یا گلے کے خوبصورت موڑ پر بے ساختہ واہ واہ کی صدائیں بلند ہو جاتیں۔ مینا بھی جیسے سحر میں ڈوب گئی تھی ....بہت لطف اٹھا رہی تھی اپنے ساتھیوں سے مکمل مل کر باتیں بھی کر رہی تھی۔

غزل ختم ہوئی ....تو تالیوں کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی ....مینا بھی جوش و خروش سے داد کے طور پر تالیاں بجا رہی تھی۔

لوگوں کی پرزور فرمائش پر اس گلوکار کو دوسری غزل بھی سنانا پڑی۔

اور جب وہ گا رہا تھا

اور

مینا سر دھن رہی تھی۔

تو وہی نگاہیں اس کو جذب کئے جا رہی تھیں

غزل ختم ہونے پر پھر تالیوں کا شور ہوا .... اور مینا نے بھی پہلے سے زیادہ جوش مسرت کے ساتھ تالیاں بجانا شروع کیں لیکن اس کے ہاتھ حرکت کرتے کرتے ایک دم رک گئے۔

پہلی قطار میں چند کرسیاں چھوڑ کر ندیم بالکل سامنے ہی بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا

محفل موسیقی رات دو بجے تک جاری رہی۔ درمیان میں کھانے پینے کا وقفہ ہوا .... ہوٹل ہی کا سٹال لگا تھا۔ برگر اور کوک وہاں مل رہی تھی .... سب نے بہت ہی لطف لیا

لیکن

مینا پہلے کی طرح چہک نہ سکی۔ سارا وقت اسے ندیم کا احساس رہا۔ وہ کبھی اپنی نشست پر آبیٹھتا تھا کبھی اٹھ کر چلا جاتا کئی دفعہ وہ سٹیج کی طرف بھی گیا۔ کارکنان مجلس سے بھی باتیں کرتا رہا۔ کئی لوگوں سے بھی ملا مینا کو اس نے دیکھا تو تھا۔ لیکن بات کرنے کی شائد ضرورت نہ سمجھی تھی۔ حالانکہ وقفے کے دوران جب مینا اپنے ساتھیوں کے ساتھ سٹال کے قریب کھڑی کھا پی رہی تھی۔

وہ دو تین بار اس کے بالکل قریب سے گزرا بھی تھا۔

مینا ٹائپ رائٹر پر جھکی تھی وہ خط ٹائپ کرنا تھے اس کے ہاتھ تیزی سے کام میں معروف تھے .... کل چھٹی تھی .... آج کام پر آئی تھی .... میوزیکل کنسرٹ رات دو بجے تک رہا تھا .... صبح چھٹی نہ ہوتی تو رات کی بیداری اور تھکان سے کام کرنا مشکل ہوتا۔ چھٹی کی وجہ سے ہی وہ اس وقت تازہ دم تھی۔

ندیم سے صبح صبح چند لمحوں کے لئے آمنا سامنا ہوا تھا اس نے دونوں خط اس کے حوالے کئے تھے۔

"اگر کوئی اور کام نہیں ہے تو یہ ٹائپ کر دیں۔ ویسے یہ اتنے ضروری نہیں .... اگر اور ضروری چیزیں ٹائپ کرنا ہوں تو انہیں بعد میں کر دیجئے گا۔ اس نے خالص افسرانہ انداز میں کہا تھا۔"

"بہت اچھا سر ...." اس نے بھی چپ چاپ خط پکڑ لئے تھے۔

حمید صاحب کی بھیجی ہوئی فائل کے حساب کے آٹھ کاغذ ٹائپ کرنے کے بعد اس نے خط نکالے اور ٹائپ کرنے لگی۔

اسی اثنا میں دروازہ کھلا

اور رحمت دین چائے کی ٹرے لئے اندر آگیا

"چائے مس صاحبہ"

"رکھ دو"

"بڑے صاحب آج بہت معروف ہیں"

"پوچھ لو .... چائے وہیں پینا چاہیں تو ادھر ہی لے جاؤ ...."

"ناراض تو نہ ہوں گے ...."

"مینا نے ہاتھ روک کر رحمت دین کی طرف دیکھا" ناراض کیوں ہوں گے۔"

"دو تین دن سے صاحب جی بات بے بات ڈانٹ پلا دیتے ہیں"

رحمت دین دانت نکالتے ہوئے بولا ....ڈر لگنے لگا ہے ان سے۔

مینا اسے ہی تک رہی تھی آہستگی سے بولی۔ "پہلے ڈر نہیں لگتا تھا۔"

رحمت دین نے نفی میں سرہلا کر کہا "صاحب نے کبھی اس طرح ڈانٹا ہی نہیں تھا ایک دفعہ ڈانٹتے تھے تو دس دفعہ پیار کرتے تھے لیکن اب ....

"مسلسل ڈانٹ کھا رہا ہوں ....جانے کیا بات ہے ویسے صاحب بڑے پریشان ہیں ان دونوں ...."

"کیوں۔؟" مینا ہونٹ کاٹ کر رہ گئی

"پتہ نہیں جی کیا بات ہے" وہ ہاتھ ملتے اور سرہلاتے ہوئے بولا۔

"تم نے پوچھ لی ہوتی ...." مینا کاغذ رول کرنے لگی۔

"بے چارے ہیں بھی تو اکیلے ...." رحمت دین جیسے اپنے آپ سے بولا۔

مینا کے ہاتھوں کی حرکت رک گئی حیرانگی سے رحمت دین کو دیکھا اور بولی "اکیلے ہیں ....؟"

"ہاں"

"ماں باپ بہن بھائی؟"

"کوئی بھی نہیں .... یہ .... جہازی سائز کوٹھی ہے اور تن تنہا رہتے ہیں"

"تم نے ان کا گھر دیکھا ہے"

"ہاں جی کئی دفعہ ...."

"کوئی بھی ساتھ نہیں رہتا ...."

اس نے نفی میں سرہلایا ...."دو چار نوکر ہیں رشتہ دار عزیز کوئی نہیں ایک بزرگ ساتھ رہتے تھے دو سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا........"

"صاحب کی بیوی بھی تو تھیں ...."

"بیوی ....؟"

"ہاں ...."

"نہیں مس صاحب ان کی بیوی نہیں .... لیکن مجھے انہیں نے بتایا تھا کہ وہ مرگئی۔"

"پتہ نہیں جی ....ہم نے تو کبھی دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی سنا تھا کہ صاحب کی بیوی ہے ....یہی خیال تھا کہ اب صاحب شادی کر کے گھر بسالیں گے ...."

"ہوں"

"لیکن"

"لیکن کیا؟........"

"اس مس ثمینہ صاحبہ سے بھی شائد کچھ ناراضگی ہو گئی ہے"

"کیا پتہ........"

"وہ تو اچھا ہی ہوا مس صاحبہ جی"

"کیوں؟"

"مجھے وہ لڑکی بالکل پسند نہ تھی۔"

"مینا ہنس پڑی۔ رحمت دین نے بڑے معصوم اور بھولے پن سے بات کی تھی۔

"تمہاری پسند و ناپسند ہی تو صاحب دیکھیں گے" وہ مسکراتے ہوئے بولی "واہ رحمت دین بڑے بھولے ہو ...."

"بات تو ٹھیک ہے مس صاحب جی ....پر صاحب جی جتنے اچھے ہیں ان کی

شادی بھی اتنی ہی اچھی لڑکی سے ہونی چاہئے ...."

"خدا کرے انہیں اچھی سی لڑکی ہی ملے ...." مینا نے اک گہری سانس لی .... اور پھر کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"چائے کا پوچھ آؤں مس صاحب جی"

"پوچھ لو .... یوں چائے ٹھنڈی ہو جائے گی اور صاحب ٹھنڈی چائے نہیں پیتے........"

"ہاں جی .... ٹھنڈی چائے تو وہ برداشت ہی نہیں کر سکتے"

"تو جلدی سے پوچھ آؤ ...." رحمت دین سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

"رحمت دین" مینا نے کچھ سوچ کر اسے آواز دی۔

"جی"

"صاحب کو صرف چائے کی اطلاع کر دو"

"یہ نہ پوچھوں کہ چائے ادھر لے آؤں"

"نہیں .... کہیں ناراض نہ ہو جائیں"

"واقعی"

رحمت دین نے دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر آفس میں جھانکا اور پھر ادھر چلا گیا۔

مینا کا دل دھک دھک کرنے لگا وہ بظاہر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ لیکن کچھ مجرمانہ سا احساس دل میں چبھنے لگا۔

چند لمحوں بعد درمیانی دروازہ کھلا اور ندیم اندر آگیا اس کے ایک ہاتھ میں اک فائل تھی دوسرے میں سگریٹ سلگ رہا تھا کام کرتے کرتے اٹھ آیا تھا۔

مینا اسے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔

ندیم صوفے پر بیٹھ گیا۔ فائل اس نے میز پر رکھ دی اور سگریٹ کے دو تین

کش لے کر اسے ایش ٹرے میں ڈال دیا۔

مینا اپنی جگہ پر کھڑی رہی

"لیٹر ٹائپ ہو گئے........" ندیم نے انتہائی بیگانگی سے بغیر اس کی طرف دیکھے پوچھا۔

"کر رہی ہوں سر........"

ندیم نے آگے کو جھکتے ہوئے چائے کی ٹرے اپنے سامنے کر لی "چائے پئیں گی؟" اس نے اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

مینا کو یہ تبدیلی ناخوشگوار سی لگی چائے تو وہ اس کے ساتھ ہی پیا کرتی تھی۔ آج اس کا یوں پوچھنا عجیب تو لگنا ہی تھا۔ اس نے صرف ندیم کو دیکھا

وہ پیالی پلیٹ میں سیدھی کرنے لگا شائد وہ خود ہی چائے بنانے والا تھا یہ بات بھی معمول کے خلاف تھی۔

مینا کو اچھا نہیں لگا وہ جلدی سے صوفے کی طرف آئی اور اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی "لائیے سر........ چائے میں بناتی ہوں"

"شکریہ .... تکلیف نہ ہی کیا کریں میں خود بنا لوں گا ...."

"سر" مینا کی آواز بھرا گئی .... ندیم نے محسوس کیا لیکن کسی قسم کا تاثر ظاہر کئے بغیر چائے بنانے لگا۔

"کل رات فنکشن کیسا لگا ...." ندیم نے چائے بنا کر ٹرے اس کی طرف کھسکاتے ہوئے پوچھا۔

کیا تھا جو وہ مینا کیلئے بھی دوسری پیالی میں چائے بنا دیتا۔ مینا کو تلخی سی محسوس ہو رہی تھی اور جانے کیوں بے اختیار رونا آرہا تھا بمشکل وہ اپنے آپ کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ ندیم کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بہت انجوائے کر رہی تھیں آپ" وہ پیالی میں چمچ چلاتے ہوئے بولا اس کی آواز میں چبھتا ہوا طنز تھا۔ مینا کو گھٹن سینے میں اترتی محسوس ہوئی وہ اب بھی چپ

بیٹھی رہی۔

"چائے بنالیں ...." ندیم نے بدستور چائے میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا۔

" شکریہ ...." مینا اٹھ کھڑی ہوئی ....اس کی آواز میں کھولن تھی۔ وہ اسے سبک کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔

"مس ثمینہ ...." ندیم صوفے پر پیچھے ہٹتے ہوئے اسے دیکھ کر بولا

مینا نے صرف اک نگاہ اس پر ڈالی

"معذرت خواہ ہوں میں نے اپنے لئے چائے بنالی آپ کے لئے نہیں بنائی وہ "

"معذرت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے سر........" وہ جل کر بولی۔

ندیم نے اس کے لہجے کا نوٹس لئے بغیر اپنی ہی رو میں کہا "صرف اس لئے نہیں بنائی کہ آپ میرا ساتھ تو دے نہیں سکتیں ...." اس نے ذومعنی بات کی اس کے لہجے میں تیروں کی سی چبھن تھی۔

"ہاں سر نہیں دے سکتی ....میں کسی کا بھی ساتھ نہیں دے سکتی" مینا کے منہ سے بے اختیارانہ نکل گیا۔

"لیکن ....کل رات........تو اپنے ساتھیوں کا ساتھ آپ خوب دے رہی تھیں ...." ندیم اٹھ کر اس کے سامنے آگیا۔

مینا نے اک گھبرائی' سٹپٹائی نگاہ اس پر ڈالی ....وہ دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے تن کر اس کے سامنے کھڑا تھا ....کچھ لڑنے مرنے کا انداز لگ رہا تھا۔

کوئی شک کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ ندیم عشق و محبت کی ان منازل پہ تھا جن میں محبوب پر اپنا پورا حق بنا مانے منوالیا جاتا ہے کسی اور کا حق تو کیا سایہ تک بھی محبوب پر پڑے تو حد برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔

مینا نا سمجھ نہ تھی انجان بھی نہیں تھی اور پھر جذبوں کی تو اپنی زبان ہوتی ہے۔ جب یہ بول اٹھیں تو کون کافر ان کی بات سمجھنے سے انکار کرسکتا ہے۔

وہ بے طرح گھبرا گئی۔

حیرت زدہ' خوف زدہ اور پریشان نظروں سے ندیم کو دیکھا وہ کچھ دھیما پڑ گیا۔

" میں نے ....میں نے انجانے میں ہی آپ سے بہت سی توقعات وابستہ کرلی تھیں مس ثمینہ" ندیم کے لبوں سے بوجھل الفاظ پھسل گئے

"سر" وہ جیسے خوف سے چیخ اٹھی اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہوگیا۔

"میں ...." ندیم نے اس کی طرف قدرے رخ موڑتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ چند لمحے چپ رہا........پھر بولا........

" یہ مری غلطی تھی ....کہ ....میں آپ کو اپنی تلاش کا حاصل سمجھنے لگا ....آپ کو دیکھتے ہی یوں لگا تھا جیسے وہ آپ ہی ہیں جس کی جستجو میری ہستی کو ہمیشہ سے پریشان کئے ہوئے تھی لیکن ...."

"سر........" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔"

"مس ثمینہ ....معاف کر دیجئے گا ....مجھے یہ سب کچھ آپ سے شائد نہیں کہنا چاہئے تھا........"

"ہاں ....ہاں........نہیں کہنا چاہئے تھا" وہ بے اختیارانہ روتے روتے چیخی

ندیم دل گرفتہ سا اسے تکنے لگا۔

مینا کے دل کا درد پھٹ کر بہنے لگا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے وہ روئے جا رہی تھی ....اس کے وجود کو جھٹکے لگ رہے تھے۔

چند لمحے بوجھل سے تھے وہ رو رہی تھی اور ندیم اسے تکے جا رہا تھا۔

"میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں مس ثمینہ ....پلیز........" وہ بولا

مینا نے بھیگی بھیگی سرخ سرخ آنکھوں سے ندیم کو دیکھا اور پھر چہرہ ہاتھوں پر گراتے ہوئے بے بسی سے بولی........"

"آپ ....آپ نہیں سمجھ سکتے سر کہ میں کتنی مجبور ہوں"

"مجبوری بتا سکیں ...... تو شائد ......" ندیم اپنے قدموں پر گھوم کر اس کی طرف پشت کرتے ہوئے رک رک کر بولا ......"تو شائد ...... میرے شوریدہ سر جذبات کو بھی ...... کچھ ......"

"سر ...... میں ...... میں شادی شدہ ہوں ......" اس نے جلدی سے کہا

تو

ندیم کو جیسے کئی سو وولٹ کے کرنٹ نے چھو لیا۔ بیساختہ گھوما اور مینا کے دونوں بازوؤں اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر سختی سے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔

"کیا ......؟؟ ......؟؟؟"

"ہاں سر ......" وہ روئے گئی۔

ندیم کے ہاتھ اس کے بازوؤں سے ڈھیلے پڑ گئے اور ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح گر گئے۔

"اوہ ...... سوری ......" ندیم تیز تیز قدم اٹھاتے کمرے سے نکل گیا۔

مینا صوفے پر گری گئی ...... اور خون دل آنسوؤں کی صورت بہانے لگا۔

مذاق زندگی کو گدگداتے' ہنساتے اور لطیف سی مسرتوں سے ہمکنار کر دیتے ہیں ...... لیکن جب زندگی سے تقدیر مذاق کرتی ہے تو اس کا ہر رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے کیونکہ یہ مذاق طنز چبھن اور پچھتاوے کے احساس کے سوا کچھ نہیں دیتا۔

مینا کی زندگی سے بھی تقدیر انوکھے مذاق کرتی چلی آئی تھی اور ہمیشہ ہی درد' کسک اور چبھن عطا کرتی تھی ...... یہ آخری مذاق تو اتنا ہولناک تھا کہ سنبھل پانا اس کے بس ہی میں نہ رہا تھا۔

وہ بے بسی سے رو رہی تھی اور اس کی کتاب زندگی کے ابواب الٹے جا رہے تھے سات آٹھ سال پہلے کی باتیں اپنی جارحانہ تازگی کے ساتھ ذہن میں اتر رہی تھیں۔

سات آٹھ سال پہلے وہ ڈھاکہ میں تھی اپنی خوبصورت اور سبزے میں گھری سرخ چھتوں والی ہٹ نما کوٹھی میں اپنی امی اور دو بنگالی نوکروں کے ساتھ رہ رہی تھی ابو کا چند سال ہوئے اچانک انتقال ہو گیا تھا ان کی کمی تو شدت سے محسوس ہوتی تھی لیکن وہ ماں بیٹی کیلئے اتنا کچھ چھوڑ گئے تھے کہ فکر فردا سے دونوں آزاد تھیں ٹھاٹھ باٹھ ابا کے وقت کی طرح قائم تھے ان دنوں اس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔

وہ لوگ بہار کے رہنے والے تھے جب ملکوں کا بٹوارہ ہوا تھا تو اس کا خاندان ہجرت کر کے ایسٹ پاکستان چلا گیا تھا جان و مال کی قربانیاں دینے کے بعد یہ لوگ اک نئی سرزمین پر ذات میں تنہا ہو کر آگئے تھے لیکن نئی مٹی کو انہوں نے اس طرح اپنایا

تھا کہ اسی میں سما جانے کی لگن پیدا ہو گئی تھی اس کے دور پار کے عزیز اب بھی ہندوستان میں تھے کچھ رشتہ دار مغربی پاکستان میں تھے ڈھاکہ میں ان کا قریبی عزیز تو کوئی نہ تھا ہاں دوسرے شہروں میں کچھ لوگ انہی کی طرح نئی لگن اور ولولے کے سہارے آباد ہو گئے تھے۔

لیکن یہ مٹی شائد انہیں اپنے میں جذب کرنے کی اہل نہ تھی تعصب کی اندھی دیوی نے اس مٹی سے جنم لے لیا تھا ان لوگوں کے خلوص محبت اور ان کو جانچنے کا اسے سلیقہ ہی نہیں تھا۔ ہجرت کرکے آنے والے ان لوگوں کو اس مٹی نے شائد سینے کا بوجھ سمجھ لیا تھا جو اٹھا پھینکنے کے درپے ہو گئی تھی۔ اندر ہی اندر اپنائیت کی فضا بکھرنے لگی تھی اور انہی دنوں فضا بے حد مکدر ہو رہی تھی دیس والوں کو دیس نکالا دیا جا رہا تھا بھائی چارے اور اخوت کے جذبات مر رہے تھے وطنیت مذہب پر حاوی ہو رہی تھی ......بنگالی اور بہاری کو علیحدہ کیا جانے لگا تھا بنگلہ دیش کا نعرہ بلند ہونے لگا تھا ......مینا کی تقدیر نے اس سے اک ہولناک مذاق کرڈالا تھا۔

ان دنوں اس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ برس تھی امتحانوں سے فارغ ہو چکی تھی اس دن وہ اپنی ایک بنگالی دوست کے ہاں مدعو تھی وہیں اسے اشرف کی امی نے دیکھا۔

اور

دیکھتے ہی لٹو ہو گئیں

"تمہارا نام کیا ہے بیٹی" انہوں نے شفقت سے پوچھا تھا۔

"ثمینہ"

"والد کیا کرتے ہیں"

"فوت ہو گئے ہیں۔

"والدہ"

"گھر پہ ہیں"

"میں آؤں گی تمہارے گھر"

"بڑی خوشی ہو گی ضرور آیئے گا"

دوسرے دن اشرف کی امی ان کے ڈرائینگ روم میں امی کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ مینا نے چائے بنا کر دونوں کو پیش کی اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی سویاں' سموسے اور مٹھائیاں پیش کیں۔

اشرف کی امی ہر دوسرے تیسرے دن آنے لگیں اور روز روز کے آنے سے ان کا مدعا بھی عیاں ہو گیا وہ اپنے بیٹے کیلئے مینا کو پسند کر چکی تھیں۔

اشرف ان دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں جاپان گیا ہوا تھا ان کا جوٹ کا کاروبار تھا۔ جو خاصا وسیع و عریض تھا۔ تینوں بھائی اس کاروبار کو مستعدی اور خوش اسلوبی سے چلا رہے تھے۔

مینا کی امی شائد رشتہ طے کرنے میں کچھ روایاتی پس و پیش کرتیں لیکن حالات اتنی جلدی بدلنے لگے کہ سوچ سے زیادہ عمل ضروری ہو گیا غیر بنگالی لوگوں کیلئے بنگلہ دیش کی سرزمین سوتیلی ماں بن رہی تھی کشیدگی اک عرصے سے جنم لے چکی تھی اور اب بڑی سرعت سے پھیل رہی تھی مغربی پاکستان سے تعلقات کے دھاگے توڑنے کیلئے جدوجہد شروع ہو چکی تھی جان و مال غیر محفوظ تھے کسی آن کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہجرت کر کے آئے لوگ اب اس سرزمین کو اپنا وطن سمجھ رہے تھے لیکن تعصب کی خونخوار دیوی جبڑے کھولے ان لوگوں کو نگلنے کے لئے بڑھ رہی تھی۔

فسادات کی آگ لگ رہی تھی کئی واقعات رونما ہو رہے تھے مل جل کر رہنے والے بنگالی اور غیر بنگالی ایک دم انجان بن گئے تھے۔

ان حالات میں مینا کی امی نے مناسب یہی سمجھا کہ مینا کے ہاتھ پیلے کریں۔

اشرف کا انتظار تھا کہ جاپان سے واپس لوٹ آئے تو اسے دیکھ لیں۔

لڑکا گھر بار خاندان سبھی کچھ اچھا تھا یہ لوگ بھی ہندوستان کے رہنے والے تھے پاکستان بننے پر لٹ لٹا کر یہاں آباد ہوئے تھے محنت اور لگن سے اپنے آپ کو بنایا تھا

...... ان کا خاندان بھی بکھر چکا تھا کچھ لوگ انڈیا میں تھے کچھ مغربی پاکستان میں ...... کافی عزیز و اقارب ایسٹ پاکستان میں بھی تھے۔

اشرف کی امی نے رشتہ مانگا

مینا کی امی نے معمولی سی پوچھ گچھ کے بعد پوری تسلی سے حامی بھرلی اپنی بچی کے لئے جس طرح کا رشتہ انہیں چاہئے تھا ...... وہ مل گیا تھا۔

منگنی کی رسم ادا کرنے کے لئے دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگی تھیں مینا کیلئے خوبصورت لباس اور زیورات خریدے جا رہے تھے مینا خوش تھی اس کی امی خوش تھی۔

لیکن

ان خوشیوں کے پس پردہ خوف و ہراس بھی تھا جو ذہنوں پر بار بن رہا تھا حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے نفرتیں اور دشمنیاں پھیل رہی تھیں ہندو مسلم کا نہیں مسلم مسلم کا دشمن جاں بن رہا تھا غیر بنگالی لوگ خاص طور پر تیغ ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔

اشرف کا لاکھوں کا کاروبار بھی دوسرے غیر بنگالیوں کے لمبے چوڑے کاروباروں کی طرح بنگالیوں کے سینے میں پھانس بنا ہوا تھا فیکٹری میں جتنے مزدور کاریگر اور کارکنان بنگالی تھے سازشوں کے جال چپکے چپکے بنتے جا رہے تھے وہ اس فیکٹری پر اشرف اور اس کے بھائیوں کا نہیں خود اپنا حق سمجھتے تھے اور اس حق کو چھین لینے کیلئے پر تول رہے تھے۔

مینا کے گھر پر بھی کئی ہندو اور بنگالیوں کی نظریں تھیں ان کے بنگالی نوکر مخبری کر رہے تھے اور فسادیوں کے لئے اندر ہی اندر کام کر رہے تھے۔

مینا کی امی پریشان تھیں ان کو تو اب اشرف اور اس کے خاندان ہی کا سہارا لینا تھا جوان بیٹی کا ساتھ تھا اور حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ آج یہاں قتل ہو گیا۔ اس کو لوٹا گیا۔ اس کی عصمت دری ہوئی۔ اس فیکٹری کو بم سے اڑا دیا گیا اس محلے پر ہلا بولا گیا۔

افراتفری اور آپا دھاپی شروع ہو چکی تھی بہت سے لوگ جن کی دور بین نظریں تھیں سمیٹ سات کر شہر چھوڑ چکے تھے کچھ نے باہر کے ملکوں کا رخ کیا تھا کچھ مغربی پاکستان چلے گئے تھے کچھ کلکتہ کی طرف رخ کر رہے تھے کچھ بہا جا رہے تھے۔

مینا اور اس کی امی بے طرح گھبرا گئی تھیں۔ خوف و ہراس میں اضافہ ان کے بنگالی نوکر کر رہے تھے من گھڑت خبریں بھی اس طرح بڑھا چڑھا کر ان کو سناتے کہ ماں بیٹی کے پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی۔

اشرف اور اس کے گھر والے اپنے مصائب ہی سے دو چار تھے چاروں طرف سے جیسے دشمنوں نے نرغے میں لے رکھا تھا جانیں ہتھیلی پر رکھی تھیں اور سرمایہ یہاں سے منتقل کرنے کی تگ و دو میں دن رات مصروف تھے۔

اسی افراتفری کے دور میں مینا کی امی اشرف کے ہاں گئیں اشرف مغربی پاکستان گیا ہوا تھا۔

اپنے خدشات اور دل کی ہول کو اشرف کی امی پر ظاہر کرتے ہوئے مینا کی امی نے دبے لفظوں میں جوان بیٹی کے غیر محفوظ ہونے کا ذکر کیا......

"ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں بہن ......" اشرف کی ماں نے ہمدردی سے کہا "بہتر ہے کہ منگنی کی بجائے نکاح کر دیں مینا بیٹی کی رخصتی بھی کر دیں تاکہ وہ اپنے گھر میں آجائے آپ بھی اکیلی ہیں یہیں آجائیں ...... اکٹھے تو ہوں گے پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا"

"جیسے آپ کی مرضی"

"اشرف پرسوں آجائے گا۔ کوئی دن رکھ لیں۔ نکاح خاموشی سے ہی کر لیں گے۔"

"بالکل ...... مجھے تو ہر وقت دھڑکا ہی لگا رہتا ہے اڑوس پڑوس والوں کی نظریں بدلی ہوئی ہیں۔"

"ادھر بھی یہی حال ہے خدا خیر ہی کرے۔"

"میری تو راتوں کی نیند اڑ گئی ہے مینا کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔"

"خدا رحم فرمائے بہن بس پرسوں اشرف آجائے تو دو دن کے اندر اندر نکاح کر کے اسے اپنے پاس لے آئیں گے انشاء اللہ کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکے گا میلی آنکھ بھی اس کی جانب نہ اٹھ سکے گی ایک اشرف ہی نہیں امجد اور اصغر بھی انشاء اللہ اس کے محافظ ہوں گے۔"

اشرف کے آنے پر نکاح کی تاریخ اور وقت مقرر ہو گیا سب کچھ انتہائی پریشانی کے عالم میں ہو رہا تھا منٹ منٹ میں حالات بدل رہے تھے اور تعصب کا طوفان اپنی لپیٹ میں سب کچھ لئے جا رہا تھا۔

چند لوگ جمع ہوئے مینا نہ تو ڈھنگ سے دلہن بنی نہ ہی بننے کو جی چاہا بس خوف اور ہول سے دل بیٹھے جا رہے تھے۔

نکاح ہوا سہمے اور ڈرے ڈرے دلوں سے ایک دوسرے کو مبارک باد دی گئی۔

اور

کھانا کھانے کے بعد دولہا کو دلہن کے ساتھ بٹھانے اور سلامی کی برائے نام رسم کرنے کے لئے اندر بلایا جا رہا تھا۔

کہ

باہر سے بلاوا آگیا اشرف کی فیکٹری کو آج رات آگ لگانے کا پروگرام بن چکا تھا فسادی پر تول رہے تھے یہی خبر اس کا معتمد خادم پہنچانے بھاگم بھاگ آیا۔

بس

پھر

کیسی رسم اور کیسا ملاپ ....بھگدڑ مچ گئی حشر بپا ہو گیا سبھی اکٹھے ہو کر فیکٹری کی جانب دوڑے ....فوج کو مطلع کیا گیا ....اشرف کی امی سینہ پیٹتے ہوئے گھر آگئیں۔

اور

اگلی صبح

خون کی ندی میں ڈوب کر ابھری

مینا کے گھر جو پہلی خبر پہنچی وہ اشرف اور اس کے سارے خاندان کے قتل اور گھر اور فیکٹری کو نذر آتش کرنے کی تھی۔

ماں تھر تھر کانپنے لگی مینا بے ہوش ہو گئی

لیکن

ماتم بھی کرنے نہ پائی تھیں کہ اس علاقے میں بھی بلوائی پہنچ گئے اگر پچھلی طرف کے ہمسائے نیک دل اور خدا ترس نہ ہوتے تو شائد مینا اور اس کی ماں کا بھی وہی حشر ہوتا جو دوسرے غیر بنگالیوں کا ہو رہا تھا ان ہمسایوں نے ماں بیٹی کو خبردار کیا۔

دونوں صرف ضروری کاغذات اور زیور ہی بیگ میں ڈال سکیں کچھ نقدی بھی تھی بھرے پرے گھر سے صرف یہی ان کے نصیب میں تھا جانے کیسے ان لوگوں نے ان ماں بیٹی کو وہاں سے نکالا اور ہوائی اڈے پر پہنچا دیا۔

مغربی پاکستان میں مینا کی امی کے کچھ عزیز تھے ابا کی تھوڑی سی جائیداد بھی تھی جو ورثے میں ان کو ملی تھی۔ ٹھکانہ اب یہی تھا۔ ماں بیٹی پہلی فلائٹ سے یہاں آگئیں۔

یوں

تقدیر نے مینا کی زندگی سے ہولناک مذاق کیا یہاں آکر سنبھلتے سنبھلتے بھی کچھ مدت لگی اور جب ٹھکانہ بنا لیا۔ حالات سے سمجھوتہ کر لینے کی ہمت پیدا ہوئی ....دلہن بنتے ہی بیوہ ہو جانے والی مینا اس صدمے کو بھولنے لگی اور اس کی امی اس کی جوانی کے بار کو پھر اتارنے کا سوچنے لگی ....تو اشرف کے زندہ ہونے کا انہیں کسی سے پتہ ملا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم والی بات ہوئی مینا ادھر کی رہی نہ ادھر کی اشرف کی منکوحہ تھی ....اشرف لا پتہ تو تھا لیکن زندہ تھا ....ایسی صورت میں انتظار ہی

انتظار تھا .... کہیں اور شادی کر دینے کا سوال ہی کہاں رہتا تھا۔

بینا کا بندھن اشرف کے ساتھ صرف کاغذی تھا۔

لیکن

یہ کاغذی بندھن اٹوٹ تھا۔

فرار کی کوئی راہ نہ تھی .... ہٹ جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اپنی جوانی کے شوریدہ سر جذبات کو بیدردی سے کچلنے کے سوا کچھ نہ کیا جا سکتا تھا اور یہی وہ کر رہی تھی۔

"رکشے والے"

"جی بیگم صاحبہ"

"اس نیلی گاڑی کو پکڑنا ہے۔"

"جی۔؟"

"جلدی پیچھا کرو اس گاڑی کا .... غائب نہ ہو جائے بھیڑ میں جلدی کرو میں تمہیں منہ مانگے پیسے دوں گی ...."

رکشا ڈرائیور نے گردن گھما کر بڑے غور سے اس معمر عورت کو دیکھا جو بے حد شریف دکھائی دے رہی تھی اور جس کے چہرے پر وحشت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات تھے بہت گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اس کی نظریں نیلی گاڑی پر جمی تھیں جو بھرے بازار کے بیچوں بیچ عام سی رفتار سے گزر رہی تھی۔ تانگے رکشے، ٹیکسیاں، ریڑھے اس بازار میں سبھی کچھ تھا۔ پیدل چلنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔

نیلی گاڑی کافی آگے تھی اس لئے اس تک پہنچنا مشکل لگ رہا تھا

لیکن

اس تک پہنچنا بے حد ضروری تھا

اتنا ضروری

کہ

موت و زندگی کا معاملہ لگتا تھا

"دیکھ کیا رہے ہو ......اوہ خدایا ......گاڑی نکل گئی ......تو ......تو ......" معمر عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ...... دانت نچلے ہونٹ میں گاڑ کر اس نے رکشے کو جیسے دھکا دیا۔

"ابھی پکڑ لیتے ہیں بیگم صاحب جی" رکشے والے نے رکشا چلایا اور بھیڑ میں سے جگہ بناتا گاڑی کا تعاقب کرنے لگا۔

مینا کی امی بازار آئی تھیں ......کچھ خریداری کرنا تھی نیشنل سٹور سے باہر نکلیں تو سڑک پر گزرنے والی نیلی بڑی سی گاڑی میں انہیں آج پھر اشرف نظر آگیا آج انہوں نے نسبتاً قریب سے دیکھا اور یقین نہ کرنے کو دل نہ چاہا۔

وہ یقیناً اور یقیناً اشرف تھا

گاڑی آگے نکل گئی مینا کی امی پہلے تو ششدر سی کھڑی جاتی گاڑی کو دیکھتی رہیں پچھتاوے اور تاسف نے بے حال کر دیا کہ آج بھی وہ نظر آیا لیکن وہ اسے پکار نہ سکیں۔

لیکن

دوسرے ہی لمحے ان کے حواس درست ہو گئے جلدی سے رکشا لے کر گاڑی کا تعاقب کرنے کی سوجھی۔

فٹ پاتھ کے قریب ہی کھڑے رکشے میں وہ جلدی سے گھس کر بیٹھیں اور رکشے والے کو نیلی گاڑی کا تعاقب کرنے کو کہا ان کی حالت غیر ہو رہی تھی رکشے والے نے گردن گھما کر انہیں دیکھا اور پھر رکشا چلا دیا۔

"خدا کرے یہ اشرف ہی ہو" ان کے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں برسوں کے چھائے محرومی کے اندھیرے چھٹتے محسوس ہو رہے تھے مینا کی زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار کرنے کے تصور سے پاگل سی ہو رہی تھیں۔

وہ یہ سوچ ہی نہ رہی تھیں

کہ

یہ شخص جو گاڑی میں بیٹھا اشرف نہ ہوا تو کیا ہوگا۔

رکشا والا معاملے کی نوعیت سے آگاہ تو نہیں تھا لیکن یہ جان گیا تھا کہ معاملہ ہے کچھ سنجیدہ نوعیت کا ......بڑی مستعدی سے وہ بھیڑ سے رکشا نکالتا ہوا گاڑی کے پیچھے جا رہا تھا۔

لیکن

بازار گنجان آباد تھا ......اچانک سامنے سے ایک ریڑھا آگیا رکشہ رک گیا ......مجبوراً رکشا آہستہ کرنا پڑا۔

یا میرے اللہ مینا کی امی رو دینے کو تھی وہ نکل جائے گا میں کیا کروں گی "

" وہ کون ہے بی بی" رکشے والے نے پوچھا۔

"میرا ......میرا بچھڑا ہوا بیٹا ...... مشرقی پاکستان میں فسادوں کے دوران کھو گیا تھا ......"مینا کی امی نے گلوگیر آواز اور ٹوٹتے لہجے میں کہا "اچانک نظر آگیا ہے"

"اوہ ...... فکر نہ کریں ......گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں جا لیں گے" رکشے والے کو اس سے بڑی ہمدردی ہو گئی۔

مینا کی امی کا بس نہ چلتا تھا کہ رکشے سے اتر کر دوڑ پڑیں دیوانہ وار دوڑتے ہوئے اس گاڑی کو پکڑ لیں " رکشے والے جلدی سے رکشا یہاں سے نکالو گاڑی دور ہوتی جا رہی ہے "

"کوشش تو کر رہا ہوں بی بی اس ریڑھے نے خرابی کر دی رکشے والے نے کہا اور گردن باہر نکال کر ریڑھا ایک طرف کرنے کیلئے ریڑھے والے پر برسنے لگا۔

خدا خدا کر کے جگہ بنی اور رکشا اس رش سے نکل پایا سڑک سیدھی ہی تھی اس لئے گاڑی پر نظر رکھنا دشوار نہ تھا۔

راستے میں بار بار رکاوٹیں آ رہی تھیں رکشا تیز چلانا ممکن ہی نہ تھا نیلی گاڑی دور ہوتی جا رہی تھی مینا کی امی کی بے تابی دید کے قابل تھی رکشے پر غصہ رکشے

والے پر غصہ' لوگوں پر غصہ' اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ آگے چل کر بازار سے دو سڑکیں دائیں اور بائیں اترتی تھیں۔

نیلی گاڑی دائیں ہاتھ مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوئی تو مینا کی امی کا دل ڈوب گیا وہ پیچھے ہٹتے ہوئے گرنے کے انداز میں سیٹ پر ٹیک لگا کر دل تھامنے لگیں آنسو آنکھوں سے بے اختیار بہہ نکلے۔ ہاتھ آتی آتی منزل چھپ گئی تھی رکشے والا بھی کیا کرسکتا تھا دل ہی دل میں ہمدردی محسوس کرکے رہ گیا۔

لیکن جب رکشا بھی اس سڑک پر آیا تو نیلی گاڑی سڑک پر دور جاتی دکھائی دی۔

"بس اب فکر نہ کرو بی بی ......گاڑی پکڑ ہی لیں گے یہ سڑک صاف ہے" رکشے والے نے سپیڈ بڑھا دی ......رکشا جیسے اڑنے لگا ......گاڑی اب نظروں کی زد میں تھی گو اس کی سپیڈ بھی زیادہ ہو گئی تھی تاہم اسے جا لینے کی امید بندھ گئی تھی۔

اس سڑک سے گاڑی مین سڑک پر آگئی اور پوری رفتار سے دوڑنے لگی۔

رکشا اس کے پیچھے تھا امید بندھ بندھ کر ٹوٹتی تھی اور ٹوٹ ٹوٹ کر بندھتی تھی۔

ڈیڑھ دو میل جانے کے بعد گاڑی دائیں ہاتھ کی کشادہ لین میں اتر گئی اور جب رکشا اس لین میں پہنچا تو گاڑی تیسری کوٹھی کے گیٹ کے اندر جا چکی تھی۔

مینا کی امی کا دل کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا رنگ فق تھا ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

گاڑی پورچ میں رک گئی تھی اور دروازہ کھول کر وہ باہر نکل رہا تھا۔

رکشا اندر آگیا تو اس نے مڑ کر حیرانگی سے رکشے کو دیکھا مینا کی امی نے غور سے اسے دیکھا وہ اشرف ہی تھا۔

وہ تیر کی سی تیزی سے رکشے سے باہر نکلیں اور اشرف کی طرف بڑھیں۔

اشرف شائد انہیں پہچان نہیں سکا تھا۔ حیران سا انہیں تکنے لگا۔

"تم ......تم اشرف ہونا ......" انہوں نے یوں کہا جیسے انکار سننے کی تاب نہ ہو۔

"جی ...... میرا نام اشرف ہے ......آپ ......؟ وہ اب بھی غور سے انہیں دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اشرف ......میرے بچے ......میں مسز ملک ہوں تمہاری آنٹی ......ثمینہ کی امی ......" وہ بنا رکے بنا سانس لئے کہہ گئیں۔

اشرف نے حیرت سے پھٹ جانے کی حد تک کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھا اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر ہو گیا پہچان کی چمک اس کی آنکھوں میں ابھری اور وہ بے اختیارانہ ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "آپ؟ ......آپ زندہ ہیں آنٹی ......آپ زندہ ہیں ...... واقعی زندہ ہیں آنٹی ......" مینا کی امی نے آگے بڑھ کر اشرف کو سینے سے لگا کر روتے ہوئے کہا "ہاں بیٹے ......زندہ ہی ہوں۔ اشرف نے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے انہیں بازوؤں سے پکڑ کر محسوس کیا۔

"اوہ ......خداوندا ......" اشرف کے منہ سے نکلا اس نے آنکھیں سختی سے میچ لیں پھر ایک دم کھول کر آنٹی کو دونوں بازوؤں میں بھر کر جیسے محسوس کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ بے یقینی سی اب بھی آنکھوں میں چھلک رہی تھی۔

"آنٹی ......آپ واقعی آنٹی ہیں نا ......"

"ہاں" وہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنے بہتے آنسو پونچھنے لگیں ......" خدایا تیرا شکر کس منہ سے ادا کروں ......"

عجیب و غریب سا ملاپ تھا۔ اشرف بار بار آنٹی کو چھو رہا تھا غور سے دیکھ رہا تھا یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ ...... بس بے اختیار ہو ہو کر روئے جا رہی تھیں۔

دو نوکر بھی ادھر آگئے ...... وہ حیرانگی سے صاحب اور اس معزز معمر عورت،

کو دیکھنے لگی۔

دروازہ کھولو......... اشرف نے آنٹی کو بازو کا سہارا دیتے ہوئے نوکر سے کہا۔

"کھلا ہے صاحب" نوکر نے آگے بڑھ کر پٹ بھی کھولدیا۔

"آیئے آنٹی ....بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں ....خدا نے غیر متوقع طور پر آپ سے ملا دیا........."

وہ انہیں سہارا دے کر اندر جانے کو بڑھا

مینا کی امی کو رکشے والے کا خیال آگیا جذباتی ملن میں وہ تو اسے بھول ہی گئی تھیں ...." رکشے والے کو رخصت کرنا ہے۔ اسے بہت سے پیسے دوں گی میں .... اس نے ہی ہمت کی میں اس کی شکر گزار ہوں۔ اشرف بیٹے یہ نہ ہوتا تو ....تو اشرف نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا اور رکشے والے کو دے کر شکریہ ادا کیا وہ خوش خوش چلدیا۔

دونوں ڈرائنگ روم میں آبیٹھے مینا کی امی تو اشرف کے تصدق ہو رہی تھیں بار بار پشت پر ہاتھ پھیرتیں خدا نے سن لی خدا نے رحم فرما دیا میری بچی کا نصیب جاگ اٹھا.........

"ثمینہ ....بھی

اشرف کے منہ سے نکلا۔

وہ بھی زندہ ہے بیٹے........." انہوں نے جیسے اس کا عندیہ سمجھ لیا۔

اشرف نے ایک بار پھر آنکھیں میچ لیں سر صوفے کی پشت پر ڈال دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

جب جذباتی مرحلے گزر گئے تو چائے پیتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کو اپنی روئیداد سنانے لگے۔

اشرف کو اپنے بھائی اور امی شدت سے یاد آگئے بار بار اس کی آنکھیں نم آلود ہوئیں بار بار آواز گھٹ گئی ....وہ بے حد دکھی اور مضطرب نظر آنے لگا وہ جس

بے دردی سے قتل ہوئے تھے وہ واقعہ آنٹی کو سناتے ہوئے وہ تڑپ تڑپ گیا۔

آنٹی ہچکیوں سے روئے جا رہی تھیں اشرف رک رک کر گھٹ گھٹ کر آپ بیتی سنا رہا تھا۔

"دوسرے دن مجھے پتہ چلا کہ آپ کی طرف بھی بلوائی جا پہنچے ہیں میں آپ لوگوں کو لینے وہاں گیا تو تباہی ہی تباہی دیکھی لوگوں سے پوچھا تو سب نے یہی کہا کہ آپ دونوں بھی بلوے میں ماری گئی ہیں........."

"آہ ....میرے بچے ....کتنے صدمے سہنے پڑے تمہیں........."

"کچھ نہ پوچھیں آنٹی ....یوں لگتا تھا پاگل ہو گیا ہوں۔"

"اللہ توبہ........."

"ایک دوست نے ہی ہمت کی اور میرا ٹکٹ خرید کر جہاز پر بٹھا دیا ورنہ جو حالت تھی خدا ہی جانتا ہے وہ دوست نہ ہوتا تو وہیں میں بھی مرکھپ گیا ہوتا........."

"اللہ نے تمہیں بچا لیا........."

"بس معجزہ ہی ہوا........."

دونوں دکھ سکھ کی باتیں ایک دوسرے سے کرتے رہے ڈھاکہ چھوڑنے سے لے کر یہاں آباد ہونے تک کی داستان ایک دوسرے کو سنائی۔

"قدرت کو شائد میری حالت پر رحم آگیا تھا" اشرف اپنی رام کہانی سناتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "جو یہاں چچا نے مجھے پناہ دی اور اپنے کاروبار میں شریک کر کے میری ہمت افزائی کی میں سال بھر بیمار رہا وہ نہ ہوتے تو شاید مرگیا ہوتا......... آنٹی نے اشرف کی بلائیں لے لیں کتنا پیار آرہا تھا اس پر۔

چچا بے اولاد تھے چچی بھی فوت ہو گئی تھیں اس لئے انہوں نے اپنا تن من دھن میرے لئے ہی وقف کر دیا اور میں جو اپنوں سے بچھڑ کر یہاں آیا تھا ان کی پناہ میں آکر زندگی کی راہوں پر چلنے کے قابل ہو گیا........."

دونوں نے ڈھیروں باتیں کرلیں تھیں اشرف اب حال میں لوٹ رہا تھا آنٹی کو

مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا "میں حیران ہوں آنٹی آپ نے مجھے پہچان کیسے لیا .... چند دفعہ ہی تو ہماری ملاقات ہوئی تھی ...."

"لو اور سنو تمہاری صورت تو دل پر نقش تھی بیٹے تمہیں پہچان لینا کوئی بڑی بات تھی ....؟"

وہ سر جھکا کر قدرے ندامت سے بولا "میں آپ کو پہلی نظر میں پہچان نہ سکا ذہن پر خاصا زور دینا پڑا تھا ...."

اس کی بات پر وہ مسکرا تو دیں لیکن دل ہول سا کھا گیا وہ انہیں بھول چکا تھ اور اب تک جتنی بھی باتیں ہوئی تھیں اس نے ثمینہ کا نام بہت کم لیا تھا اسے تو تجسس اور اشتیاق سے سب سے زیادہ اہمیت مینا کو دینی تھی۔

لیکن!!

وہ گھبرا گئیں کہیں اشرف نے اپنا گھر آباد تو نہیں کر لیا ہوا ....؟ اتنی بڑی اور ایسی شاندار کوٹھی' بغیر عورت کے تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی سج دھج اور بھی ظاہر کر رہی تھی کہ کسی سلیقہ مند ہاتھوں کا اس میں دخل اور اثر ہے۔

ان سے رہا نہ جا سکا دھڑکتے دل اور کانپتی آواز میں پوچھا یہاں کس کے ساتھ رہتے ہو ...."

"اپنوں کے ساتھ ...." اشرف نے ان دو نوکروں کی طرف اشارہ کیا جو کھانے پینے کی چیزیں واپس اٹھا کر جا رہے تھے۔ وہ کچھ نہ سمجھیں ....وسوسہ رینگتا رہا۔

"آنٹی" کئی لمحوں کے توقف کے بعد اشرف نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"ایک بات پوچھ لوں"

"پوچھو"

"آپ نے ...."

"ہاں ہاں بیٹے کہو کیا پوچھنا چاہتے ہو ....؟"

"آپ نے ثمینہ کی شادی تو نہیں کر دی ....؟"

"ہائے ہائے بیٹے .... یہ کیسے ہو سکتا تھا .... وہ تمہاری امانت ہے بیٹے"

"آپ تو مجھے مردہ سمجھ چکی تھیں .... پھر انتظار کیسا تھا"

"تمہیں بتایا تو ہے تمہارے یہاں ہونے کی خبر ہمیں کہیں نہ کہیں سے مل ہی گئی تھی .... ممانی نے تمہیں ائرپورٹ پر دیکھا تھا اس سے پہلے بھی تمہیں ہمارے اک ڈھاکہ کے ملنے والے نے کہیں کار میں جاتے دیکھا تھا دونوں نے ہمیں بتایا تھا لیکن دونوں ہی تم سے مل کر تمہارا اتہ پتہ دریافت نہ کر سکے تھے"

"ہوں ...." وہ کچھ سوچ میں ڈوب گیا

اور

ڈرتے ڈرتے آنٹی نے پوچھا "تم نے تو شادی کرلی ہو گی"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا .... پھر اک گہری سانس لی وہ بے حد مضطرب تھا۔

مینا کی امی کھل اٹھیں اطمینان کا گہرا سانس لیا ان کا انگ انگ مسکرا رہا تھا مینا کی زندگی میں سپنوں کی تعبیر ڈھلنے کے تصور سے وہ بہکی جا رہی تھیں۔

مینا ......مینا ......مینا بیٹی ...... امی نے ہاتھ میں پکڑے لفافے برآمدے میں بڑے تخت پر پھینکے اور والہانہ بے اختیاری سے بیٹی کو پکارتے ہوئے اندر آئیں۔

مینا اپنے بستر میں پڑی تھی سر کو ڈوپٹے سے باندھ رکھا تھا تکیے میں منہ چھپائے پڑی تھی ......وائل کا پھولدار جوڑا خاصا میلا ہوا تھا بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں متورم تھیں وہ شائد روتی رہی تھی۔

چپکے چپکے وہ رو تو دو دن سے رہی تھی دفتر سے چھٹی کرلی تھی طبیعت بے انتہا پریشان تھی رات کو نیند آتی تھی نہ دن کو قرار بے کلی بڑھتی ہی جا رہی تھی ندیم نے محبت کا اظہار کرکے اسے بے موت مار ڈالا تھا پاکر کھو دینے کا کرب انتہائی اذیت دہ تھا کہ اسے سوائے رونے کے کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا۔

وہ ندیم کو کبھی بھی نہیں پاسکتی تھی اس کے اور ندیم کے درمیان اشرف حائل تھا۔

اشرف ......جس کی وہ منکوحہ تھی جس سے دو بول نکاح کے پڑھوائے جا چکے تھے ان دو بولوں کے سوا کوئی رابطہ کوئی تعلق کوئی ناطہ نہ تھا اب تو کوئی جذباتی لگاؤ بھی نہ رہا تھا ایک مدت گزر چکی تھی یہ سب کچھ اک خواب لگتا تھا خواب بھی جو ٹوٹ پھوٹ کر بکھر چکا تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ پابند تھی مجبور تھی اور ایسی زنجیروں میں جکڑی تھی جنہیں توڑ نہ سکتی تھی نکاح کی آہنی زنجیریں وہ کبھی کبھی تقدیر کی اس بے

رحمی کے متعلق سوچتی ......کاش اشرف بھی اپنی ماں اور بھائیوں کے ساتھ فسادات کی نذر ہوگیا ہوتا۔

اس کے ہونے کا احساس اذیت دہ تھا۔

اس کی بے چینی اضطراب اور چھپ چھپ کر رونے کو امی نے پہلے دن ہی محسوس کرلیا تھا بڑے پیار سے پوچھا تھا "کیا ہوا بیٹی"

"کچھ نہیں"

"کچھ کیوں نہیں مجھ سے کیوں چھپاتی ہو ...... کوئی بات تو ہے"

"کوئی بات نہیں"

"یہ حالت کیسی بنا رکھی ہے"

"جی چاہتا ہے ......"

"کس بات کو"

"رونے کو"

وہ ماں سے لپٹ کر بے اختیار ہو ہو کے رو دی تھی اور ہمیشہ ماں کو تسلی و تشفی دینے والی مینا کا اس طرح رونا دھونا ماں کو کھٹکنے لگا۔

"بتاتی کیوں نہیں"

"کیا بتاؤں ماں"

"ہوا کیا ہے"

"مینا ......!"

"امی ......"

"تمہاری تقدیر کے لکھے دکھوں کو میں مٹا تو نہیں سکتی انہیں بانٹ کر تمہیں سکون تو دے سکتی ہوں۔"

مینا کے دل میں ماں کی باتیں تیر کی سی چبھن پیدا کرگئیں لیکن پھر بھی وہ اصل واقعہ ماں کو نہ بتا سکی ......بہانہ بنا گئی ......"باس نے بہت ڈانٹا ہے امی۔"

"کیوں"

"بس کام ٹھیک نہیں ہوتا"

"چھوڑ دو کام ...."

"امی"

"ہاں مینا ....چھوڑو کام ....خدا کوئی اور سبب بنا دے گا اس طرح بے عزتی کروانے سے بھوکے مرنا بہتر ہے........"

ماں کی سوچیں اس نہج پر مڑ گئیں وہ مالی مسائل سے نپٹنے کے اور طریقے سوچنے لگیں۔

آج امی بازار گئیں تو مینا پھر اپنی سوچوں میں بٹنے لگی بستر میں گھس کر وہ جی بھر کر روئی ....اسے احساس ہی نہ ہوا کہ امی دیر سے بازار گئی ہیں اور اب شام اتر چکی ہے واپس نہیں آئیں۔

مینا ...." ماں نے بتی جلائی اور دوڑ کر پلنگ پر پڑی مینا کی طرف گئیں ....بے اختیارانہ خوشی سے اس کو کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولیں "مبارک ہو ....مینا ....مبارک ہو ....میری بچی مبارک ہو۔

مینا کو انہوں نے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا وہ تو خوشی سے پاگل ہو رہی تھیں مینا نے بمشکل اپنا وجود ان کے کپکپاتے بازوؤں سے چھڑایا اور سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے حیرانگی سے ماں کو دیکھا جو پٹی پر بیٹھی تھیں امی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"کیا ہوا امی" مینا نے آہستگی سے پوچھا

"اشرف مل گیا مینا اشرف مل گیا ....مبارک ہو ....خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ....تو نے مجھ عاجز کی دعائیں سن لیں تو واقعی بڑا رحیم ہے مالک

ماں دونوں ہاتھ باندھے اوپر دیکھ رہی تھیں ....اور مینا کو جیسے سکتا ہو گیا۔

"امی ....امی ....کئی لمحوں کے بعد اس کی آنکھیں خوف سے پھیل

گئیں اور اس کے لبوں سے صرف یہی نکلا۔"

"میں نے آخر اسے ڈھونڈ لیا بیٹی میرا دل کہتا تھا وہ ضرور ملے گا تیرا سہاگ میری بچی ....تیرا سہاگ خدا سدا قائم رکھے ...." ماں کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں ....وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے مینا کو اپنی ممتا بھری دعاؤں سے بھر نواز رہی تھیں۔

مینا ششدر سی بیٹھی تھی ....امی بڑی جذباتی ہو رہی تھیں۔

چند لمحے یونہی گزر گئے ....مینا کے سینے میں اتھل پتھل ہوتی رہی اسے سمجھ نہ آرہا تھا کہ امی کی لائی ہوئی خبر مسرت بخش ہے یا وحشت خیز۔

امی نے اس کی طرف دھیان دیئے بغیر جلدی جلدی آج کی روئیداد سنا دی مینا پورے جسم سے سن ہو کر ان کی باتیں سن رہی تھی زبان گنگ تھی بس آنکھیں کھلی تھیں ....اور حیرانگی کے عالم میں امی کو تکے جا رہی تھیں۔

"وہ ہمیں مردہ سمجھ چکا تھا مینا مجھے دیکھ کر ششدر ہی رہ گیا اس کو کئی منٹ تک یقین ہی نہ آیا ...." امی نے کہا

مینا چپ تھی لیکن ٹکر ٹکر امی کو تکے جا رہی تھی۔

امی خود ہی بتائے جا رہی تھیں ....اس کی امی اور دونوں بھائی اسی رات مارے گئے تھے ....وہ بچ گیا تھا دوسرے دن ہمارے علاقے میں بلوائی آگئے تھے وہ علاقہ بھی ان کے ہاتھوں تباہ ہو گیا ....آہ ....ہمارا گھر ....ظالموں نے تباہ و برباد کر کے آگ لگا دی تھی اشرف ہمیں ڈھونڈتا پھرا تھا لیکن وہ کہتا ہے اس علاقے میں اس بے دردی سے قتل و غارت ہوا تھا کہ ہمارے بچ جانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی پھر کسی نے اسے یہ کہہ دیا کہ ہم دونوں یعنی میں اور تم بھی مارے گئے ہیں ....بے چارہ ....اف اس کی پریشانیوں کا اندازہ تو کرو بیٹی ....وہ تو یہاں آکر پورا ایک سال بیمار رہا ....صدموں نے چور چور کر ڈالا تھا اسے ...."

جو جو بات انہیں یاد آرہی تھی مینا کو سنائے جا رہی تھیں پگلا کہیں کا مجھ سے

پوچھنے لگا آپ نے مینا کی شادی تو نہیں کر دی وہ ہنس ہنس کر بتانے لگیں "ویسے ڈر میرا بھی جی بہت رہا تھا کہ کہیں اشرف نے شادی نہ کرلی ہو ......؟"

مینا نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے سر جھکا لیا اس کی آنکھوں میں ندیم کا شاندار وجیہ پیکر گھوم رہا تھا کیا ہی اچھا ہوتا جو اشرف نے شادی کرلی ہوتی اس نے دل ہی دل میں سوچا پھر تو ...... پھر تو ......؟

"میرے ساتھ آنے پر اصرار کر رہا تھا ...... اللہ بالکل بچوں کی طرح مچلنے لگا" امی مینا کے احساسات سے بے نیاز تھیں بچوں کی طرح خوش ہو کر بولیں۔

مینا نے گھبرا کر سر اٹھایا...... پھیلی پھیلی آنکھوں سے امی کو دیکھا۔

امی یوں شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے ہنس پڑیں جیسے وہ مینا کی ہم عمر سہیلی ہوں ...... اور اسے چھیڑنے کا موقع انہیں مل گیا ہو۔

اگر وہ میرے ساتھ آجاتا تو ...... تو مینا ...... وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

ان کی خوشیوں کا اندازہ کر کے مینا کا سر ندامت سے جھک گیا کتنی مدتوں بعد اس نے امی کی ایسی جاندار ہنسی سنی تھی ہر وقت ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر کر نصیبوں کے دکھ رونے والی یہ عزیز ہستی مجسم ہنسی نظر آرہی تھی۔

مینا نے اک لمحے ہی میں اپنے سارے دکھ سینے میں سمیٹ لینے کا عزم کر لیا۔

اشرف کی اطلاع پا کر وہ خوفزدہ ہو گئی تھی یہ خبر اس کے حواس پر بہت حد تک بجلی بن کر گری تھی۔

لیکن

اب

وہ ہر صورت میں حال کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کو اپنے آپ کو تیار کرنے کا سوچ رہی تھی۔ انسان بھی عجیب و غریب شے ہے کبھی کبھی تو اس کے اندر جو تبدیلیاں برسوں میں نہیں لائی جا سکتیں لمحوں میں آجاتی ہیں۔ اپنی غرض کے آگے ہر وقت ہاتھ بندھا غلام بنا رہنے والی یہ مخلوق کبھی کبھی اتنی بے غرض اور اپنی ذات سے

اتنی علیحدہ ہو کر قربانی اور ایثار کا پیکر بن جاتی ہے کہ حیرانگی بھی حیران رہ جاتی ہے۔

تو مینا ...... امی نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر ہنستے ہوئے کہا

جی وہ آہستگی سے بولی

"جو وہ ابھی میرے ساتھ آجاتا تو ......" امی نے شوخی سے کہا۔

"ہائے امی ......" اس نے ماں کی چھاتی میں منہ چھپا لیا

"نہیں بھئی ...... میں کوئی پاگل تھی جو اسے ایک دم یہاں لے آتی آخر اس نے پہلی بار آنا تھا

کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا ......"

"کیا امی"

"بھئی وہ کل شام آئے گا میں نے خود ہی کہہ دیا تھا آنا تو اسے ہے ہی ...... رخصتی کا بھی تو طے کرنا ہے نا"

مینا ساری جان سے کانپ گئی ...... ماں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا وہ بے حد خوش بڑی مسرور اور بہت ہی سرخ ہو رہی تھیں۔

"کون ہے امی"

"تیرے دفتر سے چپڑاسی آیا ہے۔"

"کون رحمت دین ...."

"شائد یہی نام بتایا ہے باہر کھڑا ہے خود جا کر بات کر لے"

امی باورچی خانے میں تھیں رات کے کھانے کا اہتمام بڑے چاؤ اور پیار سے کر رہی تھیں ان کا تو جی چاہ رہا تھا کہ بے شمار چیزیں پکا ڈالیں ....اور شائد مینا خود کھانے کا مینو نہ بنا دیتی تو وہ الٹی سیدھی کئی چیزیں بنا دیتیں۔

مینا کے ذمہ گھر کی صفائی تھی امی نے دونوں کمرے ٹھیک ٹھاک کرنے کے کام پر اسے لگایا ہوا تھا فرنیچر قسم کی چیزیں برائے نام ہی تھیں دو کمرے تھے جن میں معمولی سامان تھا پھر بھی کمروں کو سجانے بنانے سے جذبہ شوق تو عیاں ہو سکتا تھا وہ تو صبح ہی صبح ساحرہ کی طرف سے کتنے ہی خوبصورت خوبصورت پھول توڑ لائی تھیں چار کرسیوں کے درمیان رکھے ٹیبل پر انہوں نے سارے پھول ڈھیر کرتے ہوئے مینا سے کہا تھا

........"ڈیکوریشن کی اور کوئی چیز تو ہمارے پاس ہے ہی نہیں یہ پھول ہی سجا دے"

ماں کے جذبہ شوق پر مینا مسکرا دی تھی کھوکھلی سی ظاہرہ سی مسکراہٹ تھی لیکن وہ لبوں پر لے ہی آئی تھی۔

رحمت دین کی آمد کا سن کا مینا کا دل بے اختیار ہو ہو کر دھڑکنے لگا ساری رات کی شعوری کوشش سے جو پرسکون ہونے اور خوش دکھائی دینے کی اداکاری کر رہی تھی

وہ بکھرتی محسوس ہوئی دم سادھے وہ کتنی ہی دیر کمرے کے وسط میں کھڑی رہی۔

اور

جب

امی نے دوبارہ آواز دے کر رحمت دین کی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ آہستہ آہستہ چلتی برآمدے میں آ گئی بیرونی چھوٹے سے گیٹ میں رحمت دین ہی کھڑا تھا

"سلام مس صاحب" اس نے ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا وہ اس کی طرف بڑھا

مینا نے سر کے اشارے سے جواب دیا کیسے آئے ہوئے رحمت دین۔

"یہ خط ہے جی" اس نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا

"خط" مینا کے چہرے پر زردی پھیل گئی وہ ہاتھ بڑھا کر لفافہ نہ پکڑ سکی

"حمید صاحب نے دیا ہے جی اور جواب بھی مانگا ہے" رحمت دین نے کہا حمید صاحب کا نام سن کر اس کی قدرے جان میں جان آئی ....اس نے لفافہ پکڑ لیا۔

آپ اتنے دنوں سے دفتر نہیں آ رہی ہیں جی" رحمت دین نے پوچھا

"بس کام چھوڑ دیا ہے مینا لفافہ چاک کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں جی" وہ جلدی سے بولا مینا جواب دینے کی بجائے خط پڑھنے لگی دفتری قسم کا خط تھا حمید صاحب نے بھجوایا تھا دفتر سے وہ تین دنوں سے بغیر کسی درخواست کے غائب تھی یہی استفسار کیا گیا تھا اور تحریری جواب بھی مانگا تھا۔

"تم بیٹھو ....میں جواب لکھ دیتی ہیں" مینا نے برآمدے میں پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحمت دین سے کہا اور خود کمرے میں چلی گئی اس کے چہرے پر ٹھوس قسم کی سنجیدگی تھی۔

بیگ سے پن نکال کر وہ کاغذ تلاش کرنے لگی لیٹر پیڈ ملا وہ دونوں چیزیں لے کر پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی گھٹنوں پر پیڈ رکھ کر وہ جلدی جلدی لکھنے لگی۔

چند لمحوں میں اس نے دو چار سطور گھسیٹ دیں استعفے کے کیا قواعد وضوابط

تھے اسے علم نہ تھا اس نے مختصر سی سادہ سی عبارت میں نوکری جاری نہ رکھنے کا لکھ دیا لفافہ پاس نہیں تھا اس نے حمید صاحب والے لفافے ہی کو استعمال کیا اپنا نام کاٹ کر "مینجر ندیم اینڈ کو" لکھ دیا۔

یہ سب کچھ اس نے انتہائی عجلت میں کیا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی تعاقب سے گھبرا کر بے سوچے سمجھے دوڑی جا رہی ہے۔

لفافہ لا کر اس نے رحمت دین کو دے دیا۔

جو ادھر ادھر کی چند رسمی باتیں کرنے کے بعد لمبا سا سلام کر کے چلا گیا۔

اور

وہ مطمئن نظر آنے کی کوشش میں اکڑی اکڑی کمرے ٹھیک کرنے لگی۔

کہیں اردگرد بارش ہونے سے موسم خنک ہو گیا تھا شام ہوتے ہوتے تو ہوائیں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہو گئیں تھی تپش زدہ ہواؤں میں بارش کی نمی جذب ہو گئی تھی موسم کی یہ تبدیلی بڑی خوشگوار لگ رہی تھی اس بات کو امی نیک فال اور اچھا شگون سمجھ رہی تھیں صبح تو انہیں بھی ڈر تھا کہ ائرکنڈیشنڈ کمروں میں رہنے والا اشرف گرمی میں کمرے میں کیسے بیٹھے گا .... بیٹھنے والے کمرے کا چھت کا پنکھا بھی تو مرضی کا مالک تھا جب جی چاہتا اٹک جاتا اور جب جی چاہتا تیزی سے چلنے لگتا تھا۔

ہر بات امی کی مرضی اور خواہش کے مطابق یوں ہوئی جا رہی تھی جیسے حالات کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی ہو جبھی تو خوشی سے پاؤں زمین پر نہ پڑتا تھا۔

شام ڈھلنے کو تھی مغربی سمت سے ہوائیں منہ زور ہو ہو کر آرہی تھیں آسمان کے گوشے ابر آلود تھے سیاہ اور سرمئی بادلوں کے جتھے افق کے کناروں سے اٹھتے چلے آرہے تھے۔

"مینا بٹی" امی نے فارغ ہو کر مطمئن انداز میں اسے پکارا

"جی"

"نہا دھو لے اب .... ذرا اچھے سے کپڑے پہننا"

"کیوں امی"

"لو اور سنو اب یہ بھی میں ہی بتاؤں یہ وائل کے مردار سے کپڑے کیوں پہن لئے اشرف آرہا ہے۔

"اشرف ...."

ماں ہنس کر بولیں .... تو مینا کی آنکھیں خوفزدہ سی نظر آئیں .... میں .... میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گی امی ...."

وہ زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی "حد ہو گئی بھئی .... تو کیا وہ مجھے ملنے آرہا ہے جو تو سامنے نہیں جائے گی .... تیرے لئے ہی تو وہ آرہا ہے میں نے تو کل مل ہی لیا تھا .... سمجھیں ...."

مینا نے سر جھکا لیا

"جا کپڑے بدل لے میری بچی .... تم بے شک اس کے سامنے نہیں آنا .... لیکن اگر وہ تمہیں ملنے کا اصرار کرے تو .... خیر جا کپڑے تو ڈھنگ کے پہن لے .... جا .... جا میری بچی"

امی نے اٹھ کر اسے پیار سے کمرے کی طرف دھکیل دیا

کتنی ہی دیر وہ تذبذب کے عالم میں کمرے کے وسط میں کھڑی رہی اسے کچھ پتہ نہ چل رہا تھا کہ یہ موقع خوشی کا ہے یا افسوس کا۔

امی کے کہنے پر اس نے وائل کا نیا سوٹ نکال کر پہن لیا سرخ رنگ کا پھولدار سوٹ اس نے چند دن پہلے ہی سلوایا تھا برقی روشنی میں یہ رنگ اس پر کچھ زیادہ ہی کھل رہا تھا۔

بال بنانے کیلئے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنا چہرہ اجنبی سا لگا خوبصورت سیاہ آنکھیں جن پر گھنی پلکیں جھک آئی تھیں تمتمایا ہوا چہرہ .... بغیر لپ اسٹک کے پیازی پیازی ہونٹ وہ واقعی خوبصورت تھی .... لاشعوری طور پر اس نے اپنی ناک کو چھوا اور آنکھوں میں ناپسندیدگی کی لہر آگئی .... لیکن اس کے باوجود وہ بہت

اچھی لگ رہی تھی ....بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چٹیا اس نے پشت پر چھوڑ دی ....ڈوپٹہ اوڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا انسان حالات کے تابع ہوتا ہے؟

یا

حالات انسان کے تابع

جوں جوں اشرف کے آنے کا وقت قریب آرہا تھا مینا کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی جسم مٹی کے بے جان تودے کی طرح تھا ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے وجود سے کوئی الگ شے ہے اور یہی شے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وجود سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

گاڑی رکنے کی آواز کے ساتھ ہی اس کا دل جیسے تھم گیا پلنگ پر آڑی پڑی تھی اک دھچکے سے اٹھ بیٹھی ....لیکن اٹھ کر کھڑا ہونے کی ہمت نہ ہوئی ....پٹی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

وہ جان لیوا مرحلہ آن ہی پہنچا تھا

جس کے لئے

وہ کل رات سے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی

لیکن

اس لمحے اسے یوں لگا جیسے ساری کاوشیں بیکار تھیں اس کا جی چاہا اٹھ کر کہیں بھاگ جائے۔

دور چلی جائے۔۔۔ اتنی دور۔۔۔ کہ ۔۔۔

دوسرے کمرے میں سے آنے والی آوازوں کی بھنبھناہٹ اس کے کانوں میں نہ اتر سکے۔

اور بے اختیارانہ انداز میں اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ ــــــــ ـ ــــــــ ـ ــــــــ

کچھ اسی طرح بیٹھی رہی

کہ

لمحوں کی چاپ بھی اسے سنائی نہ دی

کتنا ہی وقت گزر گیا

اور

جب لمحوں کی چاپ قدموں کی چاپ میں ڈھل گئی

تو

اس نے گھبرا کر کانوں سے ہاتھ ہٹالئے ....اس کا سر اور جھک گیا قدموں ی چاپ ہولے ہولے قریب آرہی تھی اور یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ اری بھاری قدموں کی آواز اشرف ہی کے قدموں کی چاپ ہے۔

اس یقین کے ساتھ ہی وہ پسینے پسینے ہوگئی دل کانپ کانپ گیا اور سارے وجود ں تھرتھری سی پھیل گئی سانس بے ترتیب ہونے لگے اپنے آپ کو سنبھالنا دشوار لگا۔

قدموں کی چاپ اس کے قریب آکر رک گئی۔

اور

پھر

مہیب سی خاموشی پھیلی گئی فضا نے دم سادھ لیا اور مینا کو یوں لگا جیسے وہ خلا ں معلق ہو گئی ہے۔

وہ چپ تھا کئی لمحے چپ رہا زبان ساتھ ہی نہ دے رہی تھی شائد سمجھ ہی نہ پا تھا کہ اسے کیا کہہ کر مخاطب کرے۔

پھر ۔۔ پھر

ہمت مجتمع کر کے اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا

خاموشی کچھ ٹوٹی ....مینا قدرے سنبھلی محبت میں محروم اور ناکام ہونے کے واک جوان مرد کی قربت کے اح سے وہ لجا گئی۔

وہ اس کے کچھ اور قریب آگیا اور اپنی خوبصورت گردن ذرا سا جھکاتے ہوئے بولا "ثمینہ ....

اور

اور

یہ آواز!

مینا کے لاشعور شعور ذہن اور دماغ کی جانی پہچانی آواز تھی اسے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

لیکن

جب دوبارہ یہی آواز ابھری تو بے اختیارانہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا

اس کے قریب

بالکل قریب

اشرف نہیں ندیم کھڑا تھا

"سر؟ .... آپ؟" وہ گھبرا کر جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی لمحے کی پلک جھپک میں اسے اپنے استعفے کا خیال آیا اور پھر خیال خیال کو چھوتا اس خیال پر آن رکا کہ ندیم اس سے باز پرس کرنے خود آیا ہے۔

لیکن

وہاں تو باز پرس کی بجائے حیرانگی ہی حیرانگی تھی

بڑی بڑی فسوں خیز آنکھیں پوری کی پوری کھولے وہ اسے بے یقینی سے تکے جا رہا تھا۔

حیرت زدہ ــــ ششدر ــــ مبہوت ــــ

یوں جیسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ ہو

مینا بھی حیران حیران تھی

"سر........" ندیم کے لبوں سے نکلا ....اور وہ مجنونانہ بے اختیاری سے

دونوں بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھا اور پیچھے ہٹنے کی کوشش میں مینا کو ناکام کرتے ہوئے اس کا وجود بازوؤں میں بھر لیا۔

"او خدایا .... کہیں یہ خواب تو نہیں ...." مینا پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی اس نے اپنے آپ کو ان قوی بازوؤں سے چھڑانے کی کچھ کوشش کی۔

لیکن وہ تو دیوانوں کی طرح اس کے وجود پر اپنی گرفت آہنی کئے جا رہا تھا اسے سینے میں سمو لینے کی مجنونانہ سعی کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا تم .... تم........ میری ہو......... میری........ کاش......... کاش مجھے پہلے پتہ ہوتا .... کاش پہلے پتہ ہوتا۔

اور اس کے سینے میں بھنچی غشی کی سی کیفیت میں مبتلا مینا صرف اتنا ہی کہہ سکی "سر .... آپ .... ندیم ...."

"اشرف ندیم" ہولے سے ندیم نے بڑی مسحور کن سرگوشی کی۔

"اوہ ...." مینا کے لبوں سے صرف اسی قدر نکلا۔

"ندیم میرے بابا کا نام تھا ثمینہ ...." مسکراتے ہوئے ندیم نے ایک ہاتھ سے مینا کی تھوڑی کو چھو کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔

ایک لمحہ کو مینا نے آنکھیں کھول کر ندیم کی آنکھوں میں دیکھا پھر گھبرا کر شرما کر لجا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی یہ ادا

اتنی پیاری

اتنی جذباتی تھی

کہ ندیم بے اختیارانہ جھکا اور اس کے ہونٹوں نے مینا کے انگارہ سے ہونٹوں کو چھو لیا۔

ناول، افسانہ، سفرنامہ

سب افسانے میرے	ہاجرہ مسرور
آبلہ پا (آدم جی انعام یافتہ)	رضیہ فصیح احمد
متاعِ دل	رضیہ فصیح احمد
اِک جہاں اور بھی ہے	رضیہ فصیح احمد
نقاب پوش	رضیہ فصیح احمد
کالی برف	رضیہ فصیح احمد
خلائی دَور کی محبت	اختر جمال
زرد پتوں کا بن	اختر جمال
سمجھوتہ ایکسپریس	اختر جمال
انسان کی تلاش	نشاط فاطمہ
چاند ڈوب گیا	نشاط فاطمہ
رام پیاری	رحمان مذنب
بالاخانہ	رحمان مذنب
پُل صراط کا سفر	حسینہ مُعین
تتلیوں کے پَر	قُدسیہ ہُما
پت جھڑ کا آخری پتہ	عذرا اصغر
بیسویں صدی کی لڑکی	عذرا اصغر
دل کے رِشتے	عذرا اصغر
تنہا برگد کا دُکھ	عذرا اصغر
ویرانے کے پھُول	شبانہ یُونس

ہماری چند مطبُوعات

گوروں کے دیس میں	عطاء الحق قاسمی
شرگوشیاں	عطاء الحق قاسمی
ذرا انگلستان تک	علی سفیان آفاقی
دیکھ لیا امریکہ	علی سفیان آفاقی
سرگوشی	غلام الثقلین نقوی
متاعِ دل	میرزا ادیب
صحرا نورد کے خطوط	میرزا ادیب
صحرا نورد کے رومان	میرزا ادیب
دشتِ نظر سے آگے	رشید امجد
ہم تو چلے رنگون	اے حمید
جاپان کی ڈمپل	اے حمید
خانہ بدوش کے خطوط	اے حمید
جنگل روتے ہیں	اے حمید
جھیل اور کنول	اے حمید
گلاب کی ٹہنی	اے حمید
درد روشن ہے	اُمِّ عمارہ
تلاشِ منزل	قمر نقوی
عجیب لڑکی	قمر نقوی

خوبصورت اور دلچسپ ناول

رفاقتیں کیسی	رضیہ بٹ
فاصلے	رضیہ بٹ
ریشم	رضیہ بٹ
رُوپ	رضیہ بٹ
سیارہ	رضیہ بٹ
گُل بانو	رضیہ بٹ
زندگی	رضیہ بٹ
ثمینہ	رضیہ بٹ
ناجیہ	رضیہ بٹ
آئینہ	رضیہ بٹ
شائنہ	رضیہ بٹ
آئیڈیل	رضیہ بٹ

مقبول اکیڈمی شاہراہ قائدِ اعظم لاہور